عاشق شاہ

عاتق شاہ

بُنیادی طور پر مَیں طنز نگار ہوں، اور طنز میری کہانیوں اور تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر کسی کو میرے طنز میں ایک چُبھتی ہوئی کڑواہٹ کا احساس ہو تو اُسے مُنہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور ہے اور نہ میری تحریر کی کسی خامی کو دخل ہے۔ طنز کا یہ زہر تو زندگی سے آیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ آج کے آدمی کو جو زندگی ملی ہے، وہ کیسی ہے! ——

—— اس لیے اس زہر کو قبول کیجئے ——
طنز کے زہر کو قبول کرنا اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے اور طنز کو برداشت کرنا مہذب سماج کی خصوصیت

انڈین کا جُو

ٹائٹل : سعادت علی
کتابت : محمد ولی الدین
سنڈیکیٹ پرنٹرس، چھتہ بازار، حیدرآباد
طباعت سرورق : اسٹینڈرڈ اکیوپمنٹس، شانتی نگر، آئی ٹی آئی روڈ، حیدرآباد ۲۸

اعانت : اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

دسمبر ★ ۱۹۷۹ء

قیمت : آٹھ ۸ روپے

تعداد اشاعت ایک ہزار

ناشر : شگوفہ پبلیکیشنز
۳۱۔ مُجرّد گاہ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

ملنے کے پتے :
اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش 637 ۔ 4 ۔ 11، اے۔ سی گارڈز۔ حیدرآباد
الیاس احمد ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
شگوفہ پبلیکیشنز : ۳۱۔ مُجرّد گاہ۔ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

عاتق شاہ کی دیگر مطبوعات

افسانے

- ★ فٹ پاتھ کی شہزادی
- ★ ایک وقت کا کھانا
- ★ اندھیری
- ★ مائی ڈیر شکنتلا
- ★ ہم جنم جنم کے ساتھی
- ★ راستے کی کہانی

طنز و مزاح

- ★ چالیس قدم

رپورتاژ

- ★ عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک
- ★ خالی ہاتھ

تو مشقِ ناز کر.....

عاتق شاہ سے میری دوستی مسابقت کے جذبہ سے شروع ہوئی۔ ایم۔ اے میں ہم ہم جماعت تھے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد صحت مند مسابقت کا یہ جذبہ اٹوٹ محبت میں بدل گیا ــــ آج میں عاتق شاہ سے خود کو الگ نہیں پاتا۔ ان کی خوشی اور ان کا غم میری خوشی اور میرا غم ہے۔ ان کا کام میرا کام ہے۔ عاتق شاہ کے کاموں کی طویل فہرست میں ایک مستقل کام تخلیقات کی اشاعت ہے۔ لکھنے اور چھپنے کے معاملہ میں عاتق شاہ تھکتے نہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلم کی جولانی میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

۱۹۶۸ء میں جب میں نے "شگوفہ" نکالنا شروع کیا تو عاتق شاہ اُردو افسانے میں مُلک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس ابتدائی دَور میں شگوفہ کے لیے طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے حصول میں بڑی دِقت پیش آتی تھی۔ بعض سنجیدہ لکھنے والوں نے میری فرمائش پر 'شگوفہ' کے لیے مزاحیہ مضامین، انشائیے اور ڈرامے لکھے ــــ اس طرح 'شگوفہ' کی پابندیٔ اشاعت میں خالص مزاح نگاروں کے علاوہ دوسرے ادیبوں کے تعاون کو بھی دخل رہا۔ عاتق شاہ، طنز و مزاح کی اس نئی تحریک کے آغاز سے بہت پہلے افسانوں کے علاوہ طنزیہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ میری خواہش پر انھوں نے شگوفہ کے مزاج کو ملحوظ رکھ کر کئی ایک ہلکے پھلکے مضامین لکھے' جو وقتاً فوقتاً 'شگوفہ' میں شائع ہوتے رہے ــــ ان طنزیہ مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کی ترغیب بھی میں نے دی تھی ــــ مجھے خوشی ہے کہ عاتق شاہ کے مضامین کے اس مجموعہ سے 'شگوفہ' کے زیرِ اہتمام کتابوں کی اشاعت کا باضابطہ آغاز ہو رہا ہے۔ میں اسے نیک شگون اس لیے بھی سمجھتا ہوں کہ ایک کثیر التصانیف ادیب کی کتاب سے مطبوعات کے سلسلہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یقین ہے کہ یہ سلسلہ دراز ہوگا۔ اور رسالہ

شگوفہ کی طرح اس کی مطبوعات کے سلسلہ کو مقبولیت حاصل ہوگی ۔
یہ چند سطور میں ناقد نہیں بلکہ ناشر کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں ۔ اس لیے زیرِ نظر مضامین کی ادبی حیثیت کے بارے میں کچھ لکھنے کا کوئی موقع نہیں ۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عاتق شاہ نے اپنے اِنشائیوں اور طنزیہ مضامین کیلئے نئے نئے عنوانات چُنے ہیں ۔ عام روش کے برخلاف انھوں نے بڑے چونکا دینے والے موضوعات کو برتا ہے ان کے لکھنے کا انداز بھی ان کا اپنا ہے ۔ عام طور پر افسانہ نگار اپنے مخصوص اسلوب سے بہت کم انحراف کر پاتا ہے ۔ چنانچہ عاتق شاہ کے طنزیہ مضامین پر بھی یہی افسانوی لب و لہجہ غالب ہے ۔ وہ بڑے معصوم انداز میں کبھی راست طور پر اور کبھی علامتوں کا سہارا لے کر طنز کے تیر چلاتے گزر جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کے طنز کے تیکھے پن میں ہنسی کی پھلواری بھی لازماً شریک رہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ عاتق شاہ کے یہ طنزیہ مضامین آزادی کے بعد وجود میں آنے والے ادبی سرمایہ میں اپنی نوعیت کا منفرد اضافہ ہیں ۔

سب کی بھلائی چاہنے والے اُس عاتق شاہ
کے نام — جس کے مُنہ پر لوگوں نے تھوکا
اور جس پر اُس کی ہر نیکی اور خدمت کے
بدلے پتھر پھینکے گئے — اور جو پتھروں
کے ڈھیر میں گھِرا ہُوا اب بھی مُسکرا رہا
ہے، اور سمجھتا ہے کہ انسان ابھی نہیں مَرا۔

عاتق شاہ

زیر طبع
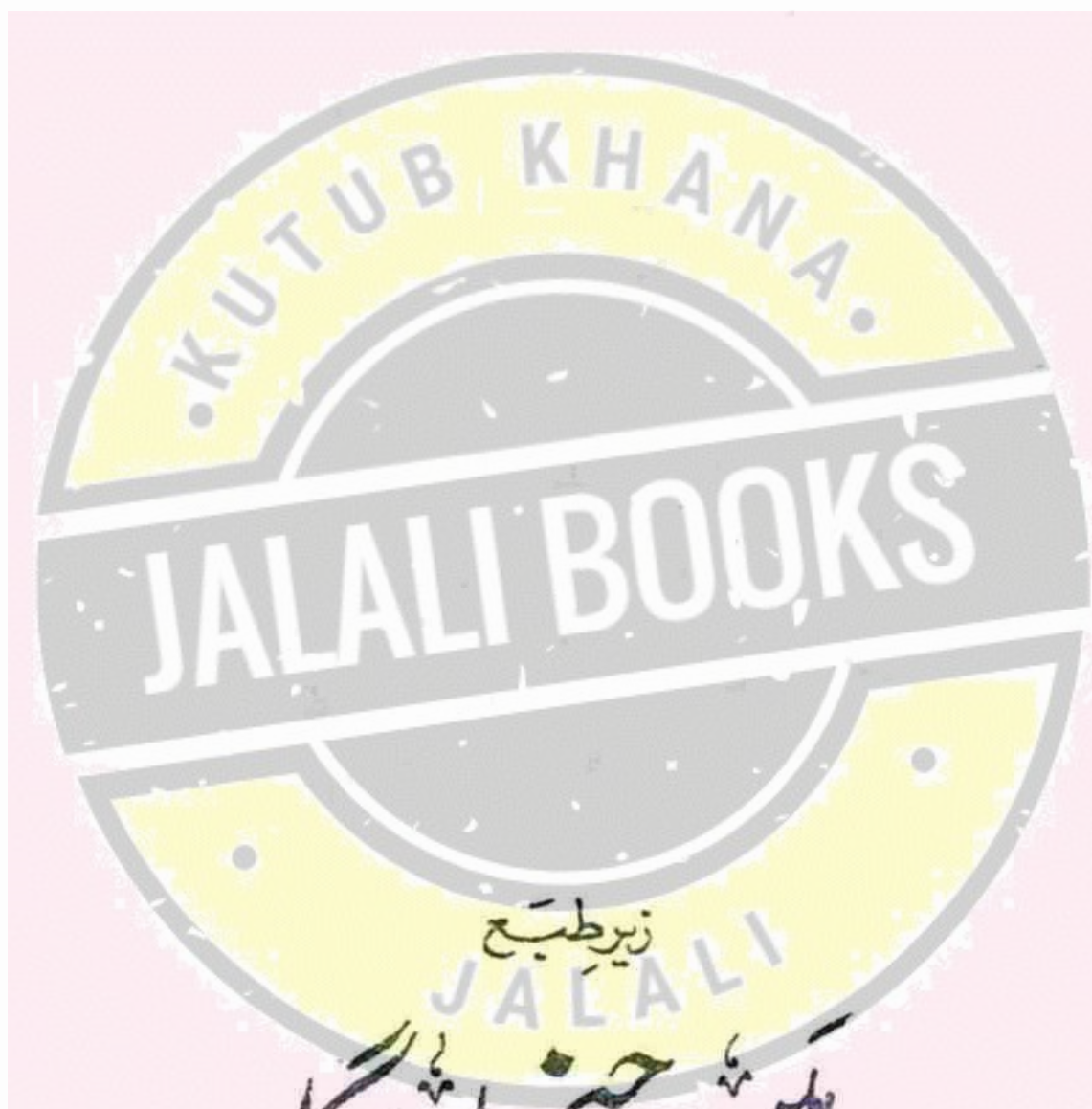
میں چیخوں گا

[ایک ناولٹ]

جسے عاتق شاہ نے روشنائی سے نہیں اپنے خون سے لکھا ہے

باتیں
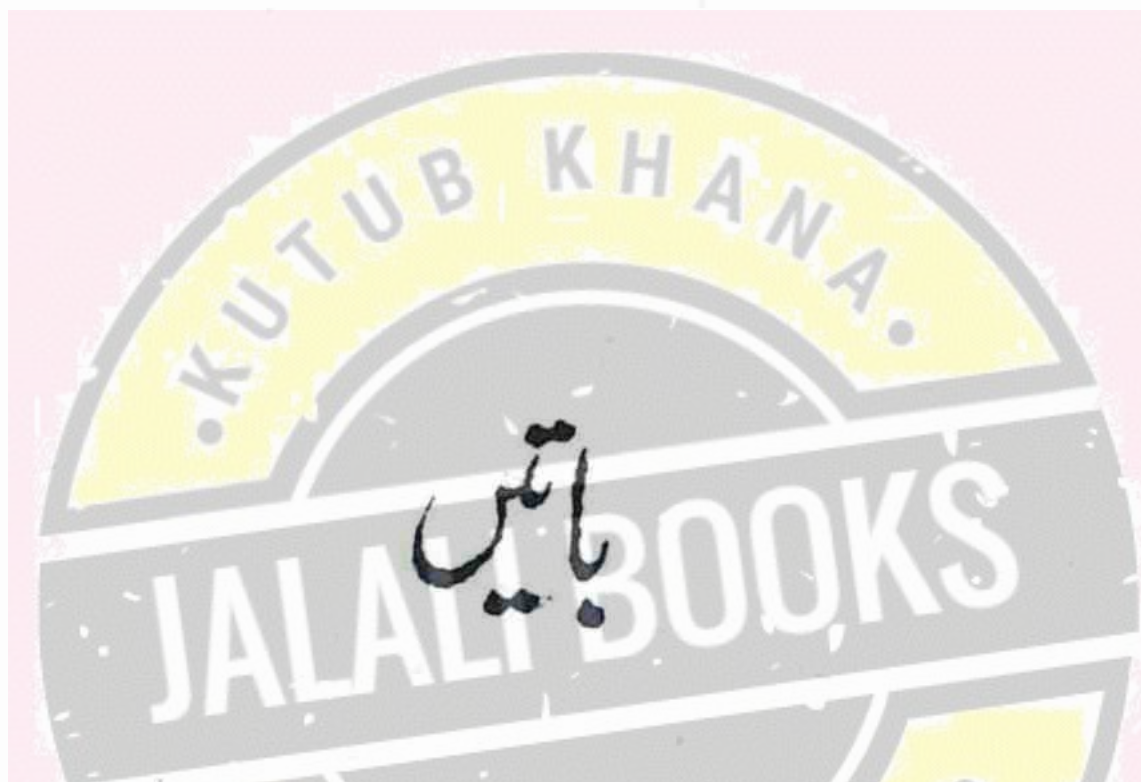
میں اپنی دسویں تصنیف "انڈین کا جو" کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ کیونکہ جب کوئی کتاب چھپ کر بازار میں آتی ہے تو وہ پرانے دوستوں سے ہی نہیں ملتی بلکہ اجنبیوں سے بھی راہ و رسم بڑھا کر دوستی کر لیتی ہے۔
اس طرح وہ بستی بستی، شہر شہر اور ملک ملک کا سفر کرتی ہوئی کسی نامعلوم قاری کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے جس سے مصنف قطعی واقف نہیں ہوتا۔ کیا یہ لمحہ خوشی کا نہیں ہوتا؟ اس لئے میں اپنے اس نامعلوم قاری کو سلام کرتے ہوئے نئے اور پرانے دوستوں سے ہاتھ ملاتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ سب انڈین کا جو کو پسند کریں گے۔

"انڈین کا جو" میرے سولہ طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں آپ کو زندگی کی

بڑی بے رحم، تلخ اور چبھتی ہوئی حقیقتیں ملیں گی۔ ان حقیقتوں پر مٹھاس کی ایک ہلکی سی پرت بھی ہے جسے آپ چاہیں تو کونین پر لگی ہوئی شکر کا نام دے دیں یا مزاح کا کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ویسے میں مزاح نگار نہیں ہوں۔ اور نہ مزاح سے میرا کوئی براہ راست تعلق ہے۔

بنیادی طور پر میں طنز نگار ہوں۔ اور طنز میری کہانیوں اور تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر کسی کو میرے طنز میں ایک چبھتی ہوئی کڑواہٹ کا احساس ہو تو اسے منہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور ہے اور نہ میری تحریر کی کسی خامی کو دخل ہے۔ طنز کا یہ زہر تو زندگی سے آیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آج کے آدمی کو جو زندگی ملی ہے وہ کیسی ہے۔ میں اس عجیب و غریب زندگی کے مختلف چہروں اور اس کے جسم میں دوڑتے ہوئے اس زہر کو پیش کرتا ہوں جسے موجودہ خود غرض سماج نے سینکڑوں معصوم انسانوں کو دیا ہے۔ زہر کا اثر زائل کرنے کے لئے کبھی کبھی زہر کا دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس زہر کو قبول کیجئے۔

طنز کے زہر کو قبول کرنا اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے اور طنز کو برداشت کرنا مہذب سماج کی خصوصیت۔ اصل میں طنز ایک وسیع سماج میں سانس لینے والی مختلف تہذیبوں، زبانوں، گروہوں اور طبقوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے تضاد کو اُبھارتا ہے۔ اور ان قابلِ نفرت حرکات کو پیش کرتا ہے جو کسی فرد یا گروہ کی ہابی سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح طنز نگار کا نشانہ سماج کا استحصال کرنے والا وہ طبقہ ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور اس کی اس ہابی سے دوسرے انسانوں کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس طرح طنز ایک مثبت عمل ہے۔ اور یہ عمل اسی وقت ممکن ہے جب طنز نگار باشعور ہو۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے

زندگی کے سارے زہر کو پی لیا ہو۔

سچ پوچھئے تو طنز ایک چابک ہے جس کا بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے ہی استعمال کیا جاتا ہے، اور ان ہی مجرمین پر برسایا جاتا ہے جنھوں نے اپنے فائدے کی خاطر انسان کو دوزخ میں ڈھکیل دیا ورنہ غلط استعمال سے چابک اُلٹا طنز نگار پر پڑنے لگتا ہے اور وہ مجمع میں تماشہ دکھانے والے اس شخص کی طرح قابلِ رحم ہو جاتا ہے جس کی پیٹھ لہولہان ہو گئی ہو۔

اپنے اپنے عمل میں طنز نگار اور مزاح نگار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ بقول کسے طنز نگار وہ ہے جو اپنے شکار کے لئے خونخوار کتوں کا تعاقب کرتا ہے اور مزاح نگار خرگوشوں کا۔ خطرناک کتوں اور نازک خرگوشوں میں جو فرق ہے وہی فرق طنز اور مزاح میں ہے۔ لیکن اس تقابل سے کسی کو یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ مزاح کسی بھی سطح پر طنز سے کم ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور مزاح نگار کو بھی خرگوشوں کے شکار میں پسینہ پسینہ ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ بڑا نازک کام ہے اس لئے میں ذاتی طور پر مزاح کو مقدس اور پاک عمل سمجھتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگوں نے اسے سفلی عمل کا درجہ عطا کیا ہے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ اس پاک عمل کو پڑھنے کے لئے عامل کا با طہارت ہونا ضروری ہوتا ہے اور اسے قاعدے کے ساتھ عمل پڑھنا پڑتا ہے۔ اگر کہیں بھول چوک ہو جائے تو منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور عمر بھر مزاح نگار کو کارٹون بن کر پھرنا پڑتا ہے۔

صرف لطیفے سنانے کا نام مزاح ہے اور نہ کسی دوا کے اشتہار کو طنز یا مزاح کا نام دیا جا سکتا ہے خواہ وہ کتنی ہی اچھی آواز اور اداکاری کے ساتھ کیوں نہ

پڑھا جائے ۔ بالکل اسی طرح وہ بھی مزاح نہیں ہے جو بعض نام نہاد فن کار کمر کو لچکا کر اور کولھوں کو ہلا کر لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی دانست میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے فن کی بلندیاں چھولی ہیں ۔ یہ محض ان کی بھول ہے ۔ اگر واقعی یہ مزاح ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے زیادہ مزاح تو ہیجڑے بھی پیدا کر لیتے ہیں ۔ یا پھر سرکس کا وہ مسخرہ جو لمبی ٹوپی پہن کر ناچ نہ جانتے ہوئے بھی ناچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن مزاح ہیجڑگی سے عبارت ہے اور نہ سرکس یا اسٹیج کے مسخرے سے جو چند لمحوں کے لئے نظروں کے سامنے آتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے اور اپنے پیچھے کوئی اثر نہیں چھوڑتا لیکن سچا مزاح تو وہ ہے کہ آدمی ہنستے ہنستے رونے لگتا ہے اور روتے روتے ہنسنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹنے لگتے ہیں اور بعد میں اسے پتہ چلتا ہے کہ اس ہنسی کے پیچھے کتنی چیخیں تھیں ۔

یہ ایک زنجیری عمل ہے، وہ طنز ہو یا مزاح اسی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں ۔ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ ویسے کسی پر اس کا اثر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کسی پر ہنسی کا دورہ پڑتا ہے اور کوئی قہقہہ لگاتا ہے ۔ لیکن اس قہقہے، ہنسی اور مسکراہٹ کے پیچھے وہی انسانی المیہ ہے جس کی طرف ابھی اوپر اشارہ کیا گیا ۔ اگر کسی پر طنز یا مزاح یا ہنسی یا قہقہے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کے لئے صرف ایک ہی چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے گالی ۔ اور گالی کی کوئی تکنک اور ادبی زبان نہیں ہوتی ۔ سیدھی سادی اور عام فہم زبان میں آپ کسی کو گالی دیجئے اور دیکھئے کہ اس کا فوری اور شدید رد عمل کیسے ہوتا ہے ۔ آپ کا مخاطب آکسفورڈ، کیمرج یا دنیا کی کسی بھی یونیورسٹی کا کتنا ہی پڑھا لکھا فرد کیوں نہ ہو آپ کے خلاف اپنی شدید برہمی کا اظہار کر دے گا ۔ اگر آپ چپ نہ ہوں اور مسلسل گالیوں سے اُسے

اور اس کے خاندان کو نوازتے رہیں تو ممکن ہے کہ وہ آپ کے سینہ میں اپنے پیار اور کی آخری گولی یا خنجر کی نوک کو جواباً اُتار دے۔ اکثر قتل وخون اور ہنگاموں کے پیچھے گالی ہوتی ہے کیونکہ گالی میں ایک بے پناہ قوت ہوتی ہے اور اس کا براہ راست اثر ہوتا ہے اور گالی کے خلاف سخت غصہ کا اظہار کوئی غلط بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ غصّہ کا اظہار اصل میں ایک احتجاج ہے۔ اور ساتھ زندگی کی ایک علامت بھی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ اس کے دل اور روح کے کسی نہ کسی گوشے میں خودداری کا ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ روشن ہے۔ اور وہ اپنی توہین کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا یہ دوسری بات ہے کہ بعض افراد اور قوموں پر گالی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ایسے بے حس افراد کا اب ذکر ہی کیا جو کسی بھی انسانی سماج کے لئے ایک سوالیہ نشان بنے رہتے ہیں۔ اور جو دماغی کینسر میں مبتلا ہیں۔ میرے مخاطب تو وہ سینکڑوں، لاکھوں معصوم اور اچھے انسان ہیں جن کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں ہیں اور جو مسکراتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں اور جن کے دل بڑے ہیں۔ اور جو میری تحریروں کا سرچشمہ ہیں۔ میں ان ہی کے لئے لکھتا ہوں۔ لکھتا کیا بلکہ گزرتا ہوا کوئی نازک لمحہ مجھ سے لکھوا لیتا ہے۔ میں نہیں جانتا اس نازک لمحے کو اپنی گرفت میں لینے کی میں نے کتنی کوشش کی۔ یہ تو آپ مجھے بتائیں گے۔ اسلئے میں اپنے مضامین پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے پڑھنے والے اور آپ ہی میرے بہترین نقاد ہیں۔ البتہ مجھے خوشی ہوگی کہ میرے پڑھنے والے اور آپ دنیا کو اور زندگی کو اسی زاویئے اور نکتہ نگاہ سے دیکھیں جیسا کہ میں نے دیکھا ہے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح میں اس سفر میں تنہا نہیں رہوں گا۔

اس مجموعے میں شامل تمام مضامین ملک کے منفرد ماہنامہ "شگوفہ" میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ میرا یہ دسواں مجموعہ شگوفہ کے اشاعتی پروگرام کی اولین پیش کش کی حیثیت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس تعلق سے میں اپنے عزیز دوست مصطفٰے کمال کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اشاعت کے لئے میرا مجموعہ منتخب کر کے مجھے نہیں بلکہ عوامی ادب کو یہ اعزاز عطا کیا ہے۔

حیدرآباد میں طنز و مزاح کی اشاعت اور بقا کے لئے مصطفٰے کمال اب ایک ضرورت بن گئے ہیں۔ اور ان کا نام شخصیت کے خول سے نکل کر ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ محض اس لئے کہ مصطفٰے کمال کام کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ اور ان کے قدم مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ میں اپنے ان تمام پڑھنے والوں کا خلوصِ دل کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے "عاتق شاہی اسکیم" کے تحت پیشگی قیمت ادا کر کے میری کتاب خرید لی۔ اسے میں اپنے لئے ایک بڑا ایوارڈ سمجھتا ہوں، جبکہ اُردو کے شاعر اور ادیب کتابیں چھپوا کر برسوں بیٹھے رہتے ہیں اور کوئی کتاب کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ ایسی صورت میں کسی اُردو کتاب کا چھپنے سے پہلے بک جانا معجزہ نہیں تو ایک معمولی اور حقیر بات بھی نہیں۔ اہلِ نظر ذرا غور فرمائیں۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے پڑھنے والوں نے شگوفہ پبلی کیشن کی پہلی پیش کش "انڈین کاجو" کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مفت خوری تو عام ہے ہی، لیکن مفت کتابیں پڑھنے کی علت بھی کچھ کم نہیں اس لئے میں اپنے پڑھنے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے دوستوں یا

رشتہ داروں کو مفت پڑھنے کی اجازت نہ دیں، بلکہ ان سے کہیں کہ وہ خرید کر پڑھیں۔ اور خریدنے کے لئے براہ کرم اپنے پرس کو کھولنے کی زحمت گوارا کریں۔

میں نہیں جانتا کہ اپنے کس دوست کا نام لوں جس نے مجھ سے تعاون کیا۔ یہ ایک طویل فہرست ہے۔ پھر بھی جن ادیب دوستوں، شاعروں اور دانشوروں نے میری مدد کی ان میں محمد اقبال احمد، شیخ حیدر، رحمٰن جامی، صفدر حسین، سید جمیل احمد، ڈاکٹر ایم عبدالرشید، ڈاکٹر محمد عبدالصمد فاضل، محمد عبدالمقتدر سکندر، اقبال شیدائی، ظہور الحسن، میر معظم علی، ہلال مرتضیٰ، مسیح انجم، رقیب ذیر زماں، مصلح الدین سعدی، یعقوب میراں مجتہدی اور ڈی پی مترا قابلِ ذکر ہیں۔

آخر میں اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے ارباب اقتدار کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے کتاب چھپوانے کا موقع فراہم کر کے سرخرو ہونے کا موقع عطا کیا۔ ورنہ کتاب چھپوائے بغیر بھی آدمی سرخرو ہوتا ہے۔ اور سر اونچا کر کے چلتا ہے۔ یہ دوسری بحث ہے کہ اس عمل سے میرا سر اونچا ہوا یا نہیں ! آپ خود فیصلہ کیجئے۔ ویسے میں بے قصور ہوں۔ اور اگر پوچھنا ہی ہو تو اُردو اکیڈیمی سے پوچھئے کہ ایسے ویسے فضول مسودوں کو کیوں نوازا۔ البتہ اُردو اکیڈیمی کے مئے اور اس کے ذہین سکریٹری اور ڈائرکٹر چیندر مری واستو سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں ایسی غلطی نہیں کریں گے۔

ممتاز آرٹسٹ سعادت علی خاں اور محمد ولی الدین خوشنویس کا میں کیا شکریہ ادا کروں جبکہ یہ دونوں میرے کام کو اپنا کام سمجھ کر کرتے ہیں۔

اور ساتھ ہی اپنے دوست سلام خوشنویس کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ابتدائی صفحات لکھے، حالانکہ ان کے تعلق سے ادبی حلقوں میں بڑی خوفناک خبریں مشہور ہیں کہ وہ وعدے کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن جس دن میں نے ان سے درخواست کی، اسی دن انھوں نے میرے کام کی تکمیل کی۔ شکریے کے ساتھ جب میں نے حیرت کا اظہار کیا تو سلام نے کہا کہ کیسے نہیں کرتا، فیلڈ مارشل کا کام جو ٹھیرا!

عاتق شاہ

۶؍ دسمبر ۱۹۷۹ء
چنچل گوڑہ، حیدرآباد (اے پی)

ناک

میں نے قسم قسم کی ناکیں دیکھی ہیں۔ آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔ لمبی، اونچی، کھڑی، بیٹھی، چپٹی، مختصر، موٹی، دبلی، پتلی، پھیلی۔ اور بعض اوقات تو ناک کی بجائے صرف دو نتھنے، ویسے وہاں ناک ضرور ہوتی ہے۔ دراصل ناک کو چہرے سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور نہ دیکھنا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ کچھ ایسی ہی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ سوائے مایوسی کے کچھ نہیں۔ ناک کسی فرد کی ہو، وہ اسی کے چہرے پر فٹ ہوگی، دوسرے کے چہرے پر نہیں۔ دوسرے بعض حضرات یا خواتین کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش ان کی ناکیں بڑی ہوتیں یا چھوٹی ہوتیں۔ یا کسی طرح یہ سب آپس میں ادل بدل کر لیتے۔

ناک کے بغیر کسی چہرے کا تصور ممکن نہیں، خواہ وہ انسانی چہرہ ہو یا جانور۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گھر بغیر دروازے کے۔

واہ تمہاری ناک بھی ہے جو تم اتنا اکڑ کر بات کر رہی ہو ــــ ؟

کسی محفل میں کسی کا فقرہ گونجتا ہے۔ یا نجی ملاقات میں کوئی ایک دوسرے سے کہتا ہے۔ اور سننے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ بات جس سے کہی گئی ہے اس میں ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ یقیناً اس عورت نے یا لڑکی نے اس اعتماد کو ضرور دھکا پہنچایا ہوگا جو کسی نے اس پر کیا تھا۔ اس لئے وہ پوچھتا ہے کہ کس ناک سے بات کر رہی ہو تم۔

ناک سے گننے کا ڈر کسے نہیں!

ہر ایک اپنی اپنی ناک کو بچانا چاہتا ہے۔ ناک خواہ وہ مرد کی ہو یا عورت کی ناک ناک ہے۔ لیکن ہر ایک کی ناک کو ایک ہی فیتے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ ناک بلحاظ پوزیشن بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ لیکن یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اس سماج میں صرف اس کی ناک زیادہ اونچی ہے جو امپالہ کار میں گھومتا ہے۔ خواہ وہ کار اسمگلنگ کے کالے دھندے سے ہی کیوں نہ حاصل کی گئی ہو۔

اس کے برخلاف میں نے ایسے کئی ایمان دار اور سچے لوگوں کو دیکھا ہے جو بھوکوں مرجانا پسند کرتے ہیں لیکن کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ محض اس لئے کہ ان کی ناک نہ کٹ جائے۔ لیکن اس کے باوجود ان شرفاء کی ناک چوروں کی ناک کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہے۔ ویسے ان دونوں کی ناکوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔ البتہ شریف اور رذیل میں ایک قدر مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ دونوں اپنی اپنی ناکوں کی حفاظت کرتے ہیں ــــ شریف تو شریف ہی ہے۔ رذیل اس لئے کہ کسی دوسرے رذیل کو اپنے میدان میں آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ یہ اس کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

کیا شریف کیا رذیل' یہ بات سب کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ادیب' شاعر' لیڈر' پروفیسر' ڈاکٹر' فلم ایکٹر و ایکٹریس سب ہی اس تعریف میں آتے ہیں۔ ادھر

ایک اپنی ناک کو اونچا کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہے اور مار رہا ہے۔

سچ پوچھئے تو ناک جسم کے صرف ایک عضو کا نام نہیں۔ بلکہ ایک سمبل ہے، فرد کی انا کا۔ اور کبھی یہ انا بڑھ کر گھر کی اور پھر خاندان کی انا بن جاتی ہے۔ تب یوں ہوتا ہے کہ خاندان کا ہر چھوٹا بڑا اس کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پہ محمد لسین کی لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اور بھاگنا ظاہر ہے بُری بات ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایک دور کے رشتہ دار ظہیر الدین پہ دل کا دورہ پڑتا ہے۔ اگر آپ مزاج پرسی کے لئے ظہیر صاحب کے یہاں جائیں اور ان سے پوچھیں تو وہ نہایت سنجیدگی سے کہیں گے:

بھائی تکلیف کیسے نہ ہو۔ خاندان کی لڑکی ہے۔ اب ہم اتنے بے غیرت کیسے بنیں کہ کسی کی آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کریں۔ ناک جو کٹوادی ہے اس چڑیل نے۔

بالکل اسی طرح اگر اس بات کو کسی محلہ کے وقار کا مسئلہ بنایا جائے یا بن جائے تو پھر محلّے کی ناک خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ اسی طرح یہ خطرہ اپنے بلدیاتی حدود طے کر کے کسی شہر یا صوبے کی ناک کے لئے ایک مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ اور کوئی محلہ یا صوبہ یا شہر یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی ناک کٹ جائے۔ کیونکہ ناک صرف افراد کی نہیں ہوتی بلکہ شہروں اور ملکوں کی بھی ہوتی ہے۔

آج اقوامِ عالم میں امریکہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی ناک سب سے اونچی۔ روس کو یہ شیخی پسند نہیں۔ ظاہر ہے وہ بھی چہرے پہ ناک رکھتا ہے۔ چین کی تو ناک ہی کہاں تھی۔ اور اگر تھی بھی تو چپٹی چپٹی، بیٹھی بیٹھی، لیکن دنیا کا کوئی ملک براہ راست اس کے مقابلے میں خم ٹھوک کر آنے کے لئے تیار نہیں، سب ڈرتے ہیں کہ کہیں اس جھگڑے میں ان کی ناک کو مٹی نہ لگ جائے۔ ویسے ہر بڑے چھوٹے ملک کی ناک کے تحفظ کے لئے یونائیٹڈ نیشنز کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس ادارے کے یہاں دنیا کے تمام ممالک کی ناکوں کے فوٹو اور

اس کی کاپیاں موجود ہیں۔ لیکن آج تک اس ادارے نے کسی کی ناک نہیں بچائی۔ البتہ ناک کٹنے کے بعد اس کی مرہم پٹی کا بڑے پیمانے پر انتظام کرتا ہے۔ سُنا ہے کہ دنیا جہاں میں امبولنس کاریں جتنی اس ادارے کے یہاں ہیں اتنی کہیں نہیں۔

اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی ملک یا فرد اپنے امیج کو یعنی ناک کو محفوظ رکھنے کے لئے خودکشی کرلیتا ہے۔ خودکشی کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ پھندے پر لٹک جانے کو بھی یہی نام دیا جاتا ہے اور اپنے نفسِ امارہ کے مارنے کو بھی۔ ٹرینوں سے ٹکرا کر اور تالابوں میں گر کر جو خواتین اور حضرات مرتے ہیں وہ خودکشی کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہوتے۔

ملکوں کا بھی یہی حال ہے۔ کبھی کوئی ملک سخت قحط کے ریگستان میں جل کر بھسم ہوجاتا ہے اور کبھی کوئی جہالت، تعصب، فرقہ واریت، ذات پات اور نفرت کے سمندر میں غرق ہوجاتا ہے۔ ورنہ جو ملک خودکشی نہیں کرتے وہ قاتل بن کر دوسروں کو قتل کرتے ہیں۔ دنیا جہاں کی فوجیں، ٹینکس، دبابے، جہاز، ایٹم بم سے لے کر ہائیڈروجن بم تک محض اس لئے ہیں کہ ایک ملک اپنی ناک کو اونچا کرنے کے لئے دوسرے چھوٹے ملک یا کمزور ملک کے ہزاروں انسانوں کی قبریں بنا دیتا ہے۔

اور جو ملک یا فرد اپنی ناک کٹنے کی پرواہ نہیں کرتا اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ بہادر وہ ہے جو اپنی ناک کے کٹ جانے کے بعد مسکراتا ہوا دوسروں کی ناکوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ سب کی سب نقلی ہیں۔

ہوائی چپّل

چپلوں میں چپل ہوائی چپل ہے۔

اور جس کے پاس ہوائی چپل ہے اس کے پاس گویا سب کچھ ہے۔ اور جو اس نعمت سے محروم ہے وہ دنیا کا فالتو ترین آدمی ہے۔

بھلا غور کیجیے کہ آخر وہ آدمی ہی کیا جس کے پاس ایک ہوائی چپل نہیں۔ یعنی ہوائی چپل نہ رکھنا اور وہ بھی اس ماڈرن زمانے میں حیرت کی بات نہیں بلکہ مضحکہ خیز بات بھی ہے۔

کسی بھی محفل میں جائیے، باغ میں چہل قدمی کیجیے، ریلوے پلیٹ فارم پر ٹہلیے یا اپنے کسی دوست اور عزیز کے گھر جائیے، دیکھنے والے کی پہلی نظر آپ کے چہرے پر سے ہوتی ہوئی پیروں پر آکر ٹک جائے گی۔ اب یہ بات کہ پیروں اور چہرے کا آپس میں کیا تعلق ہے دوسری بحث کو چھیڑتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پیر پیر ہیں اور چہرہ چہرہ۔ اور ان دونوں کے بیچ میں ایک طویل فاصلہ ہے۔ مگر انسان کی اس کمزوری کا کیا کیا جائے کہ وہ اس معاملے

ہیں اُوپر سے نیچے آتا ہے۔ اور ذاتی منفعت کے لئے نیچے سے اُوپر جاتا ہے۔ تضاد اپنی جگہ باقی ہے جس کا بالکلیہ تعلق فرائیڈ سے ہے۔ لیکن فرائیڈ بھی شعور اور تحت الشعور کی گتھیوں کو سُلجھاتے ہوئے دماغ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پیروں تک پہنچنے کے لئے شاید اُسے صدیاں لگ جاتیں۔ اس لئے پیر آج بھی جسم کے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اور یہ دنیا کے عظیم مفکروں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ البتہ اُردو غزل کے قدیم شاعروں نے محبوبہ کے پاؤں کی خوبصورتی کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن ان بے چاروں کے ساتھ ایک المیہ یہ ہوا کہ یہ اپنی محبوبہ کے قدموں پر جان دینے کی حسرت کو لئے مر گئے۔ لیکن محبوبہ کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ کم ازکم قبر پر جا کر دو پھول تو چڑھاتی۔ آخر اس میں اس کا کیا جاتا۔ ایک پھول اپنی طرف سے اور دوسرا رقیبِ روسیاہ کی طرف سے۔

صرف اُردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ اُردو نثر میں بھی، داستانوں میں محبوبہ کے پیروں کی خوب صورتی کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر محبوبہ کے پیر خوب صورت ہوں۔ اگر واقعی خوب صورت ہیں تو اس کے اچھے چہرے کا مالک ہونا ضروری نہیں۔ چہرے کو دیکھ کر پَیر کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اور اسی طرح پیروں کو دیکھ کر چہرے کے بارے میں کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ پورے جسم میں صرف پَیر ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ اور پیروں کے علاوہ کوئی چیز خوب صورت نہیں ہوتی۔ بہر حال کچھ بھی ہو، غیر شعوری طور پر نظریں اُوپر سے نیچے کی طرف پھسلتی ہیں۔

بھدّے اور بدنما پَیر پلاسٹک سرجری کے ذریعہ بدلے تو نہیں جاسکتے البتہ ایک خوبصورت چپّل کی جوڑ اس کمی کو پورا کرسکتی ہے۔ اس لئے حقیقت سے واقف ہوئے بغیر دیکھنے والا اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگتا ہے۔

چپّل اصل میں صنفِ نازک کے استعمال کے لئے ایجاد ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے کردار میں سو فیصد نسائیت ہے۔ نازک سی، ہلکی پھلکی اور رنگ برنگی۔

مگر ہوا یوں کہ مرد نے صنفِ نازک کو اپنانے کے بعد اس سے متعلق ہر شئے کو بطور حق استعمال کرنے لگا. سوائے ساڑی، بلاؤز اور چوڑیوں کے. البتہ جہاں تک چپل کا معاملہ ہے اب یہ عورت مرد دونوں کی مشترکہ مِلکیت ہے. خیر گھر کی چار دیواری کی حد تک چپل کا استعمال ٹھیک ہے، ورنہ باہر کی دنیا میں جب مرد اپنے موٹے موٹے پاؤں کو ایک نازک سی شئے میں ٹھونس کر مستانہ وار چلتا ہے تو بڑا الجھا اور ڈھیلا ڈھالا سا لگتا ہے.

حد یہ ہے کہ بعض زندہ دل شوہر اپنی بیویوں کی خوب صورت نازک سی چپلوں میں اپنے گز بھر پاؤں کی صرف انگلیوں کو ڈالے شہر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں. دھول سے اَٹے ہوئے پاؤں اور حسین چپل کی تباہی پر اگر آپ نے توجہ دلائی تو ہنس کر ارشاد فرمائیں گے کہ بھائی جلدی میں نکل گیا. اور اس وقت میں جب نکل رہا تھا میری چپل تمہاری بھابی کے پیر میں تھی. اور بھابی غسل خانے میں تھیں.

یہی نہیں اگر آپ کو کسی کے یہاں مہمان بننے کی سعادت نصیب ہوئی ہو تو اس بات کا ضرور اندازہ ہوا ہوگا کہ صابن اور تولیہ سے لے کر چپل تک آپ نے میزبان اور اس کے افرادِ خاندان کے استعمال کی ہے. بعض گھرانوں میں اس چپل نے عشق کی آگ کو بھڑکانے کا کام بھی انجام دیا ہے. مثلاً چپل کی خوبصورتی کو دیکھ کر چپل والی پر عاشق ہو گئے. شادی کے بعد ہی پتہ چلا کہ چپل نے عاشق کو صاف صاف دھوکہ دیا ہے. مگر اس میں دھوکے کی کیا بات ہے.

چپل کا اپنا ایک رول ہے، کردار ہے، اور اس کا اپنا ایک چہرہ ہے. کبھی یہ دلوں کو جوڑتی ہے تو کبھی دلوں کو توڑتی ہے. رقیبِ روسیاہ کی مزاج پرسی اس سے کی جاتی ہے. یہ دوسری بات ہے کہ اس عمل کے بعد بھی رقیب کی محبت کا نشہ نہیں اُترتا.

لیکن ان شخصی رشتوں اور ناطوں سے ہٹ کر سماجی اور سیاسی سطح پر چپل سے بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں. معزز ارکانِ اسمبلی و پارلیمنٹ کسی بل یا تحریک کے خلاف

بطور اظہار ناراضگی اپنی اپنی چپلوں کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور چپلوں کی مدد سے میز کو بجاتے ہیں اور باقاعدہ انگریزی میوزک شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا شدید ردعمل یہ ہوا کہ عوام آج کل اپنے رہنماؤں کے نقش قدم پر چل کر چپلوں کا آزادانہ استعمال کر رہے ہیں۔ بول چال کی زبان میں ہر تین چار فقروں کے بعد ایک آدھ چپل آ ہی جاتی ہے۔

آج کل پبلک اپنے رہنماؤں کے پڑھائے ہوئے سبق کو اس طرح دہرا رہی ہے کہ عوامی جلسوں میں سٹ نشین پر چپل پھینک رہی ہے۔

ایک حساس قومی رہنما نے برہم ہو کر کہا تھا "مجھے آج ہی پتہ چلا کہ آپ کے شہر میں چپلوں کا کاروبار بڑے پیمانے پر چل رہا ہے۔"

حالانکہ لیڈر کا مقصد یہ تھا کہ چپل پھینکنے والوں کو عبرت دلائی جائے۔ مگر اس کا اثر اُلٹا ہوا۔ اور پانچ منٹ تک چپلوں کی بارش ہوتی رہی۔ قسم قسم اور رنگ برنگی چپلوں کی۔

اصل میں، چپل ہمارے تہذیبی سفر کا ایک حصہ ہے۔ ورنہ وہ تقریب ہی کیا جس میں چپلوں کا تبادلہ عمل میں نہ آئے۔ شوز، سینڈل، اونچی ایڑی کی جوتی اور فوجی نما جوتوں کو یہ سہولت حاصل نہیں جو ایک عدد چپل مہیا کرتی ہے۔ یوں بھی ہمارا ملک گرم ہے۔ اس لئے آب و ہوا اور مزاج کے اعتبار سے چپل ہی ایک ایسی موزوں ترین شے ہے جو دن بھر ایک اچھے رفیق کی طرح ساتھ دیتی ہے۔ اور رات کو سوتے وقت سرہانے کا تکیہ بن جاتی ہے۔ نرم، ملائم اور آرام بخش۔

سچ تو یہ ہے کہ آج چپل آدمی کا مقدر بن گئی ہے۔

قسم قسم کی خوبصورت چپلوں اور چمکیلے جوتوں کی صنعت میں ہمارے ملک نے جو ترقی کی ہے اس کا مقابلہ ایشیا کا کیا دنیا کا کوئی ملک نہیں کر سکتا۔ آزادی کے بعد ہم نے چپلوں اور جوتوں کے کاروبار کو نہ صرف آگے بڑھایا ہے۔ بلکہ انٹرنیشنل مارکٹ میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ اس لئے جب کبھی کسی ملک کو جوتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو فوراً ہمیں اپنا

آرڈر بک کرواتا ہے۔

جوتا ہو یا چپل اس سے کسی حال اور کسی صورت مفر ممکن نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چپل قومی اور شخصی زندگی میں ہماری شخصیت کا ایک اٹوٹ حصّہ ہے۔

اگر چپل اپنی ذاتی نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے سمجھ دار لوگ کبھی دکان جا کر چپل نہیں خریدتے بلکہ مسجد جا کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ آخر خدا کا گھر کس کام کے لئے ہے۔ بہر حال چپل کی فکر مت کیجئے۔ اپنے گھر میں ہوں یا کسی کے گھر میں اللہ کا نام لے کر کسی بھی سائز کی چپل میں پیر ڈالیے یوں محسوس ہوگا جیسے ساتویں خلا باز آپ ہی ہیں۔ تلوے بڑی ملائمت محسوس کریں گے جیسے کسی نے آپ کے قدموں میں کشمیری قالین بچھا دیا ہو۔ اور اس کے بعد کے میلوں دور کے فاصلے آپ چٹکی بجاتے ہوئے طے کر لیں گے۔

چپل کے استعمال پر لباس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ جیسے آپ شوز کو دھوتی یا لنگی پر نہیں پہن سکتے۔ اگر پہن لیں تو آپ اجڈ اور گنوار سمجھے جائیں گے۔ لیکن آپ چپل کو بلا تکلف شلوار، پاجامے، دھوتی، پتلون، شیروانی اور سوٹ پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ بھی نہ دے گا۔

یہ سادگی صرف چپل کے حصّے میں آئی ہے اور یہ اس کے کردار کا دوسرا اہم پہلو ہے۔ کھدر کے کپڑوں پر چپل خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو چمکنے لگتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کھدر چپل کے لئے اور چپل کھدر کے لئے ہے۔ وہ پوپلر چپل ہوائی بھی ہو سکتی ہے یا کوئی اور۔ لیکن ہوگی تو وہ چپل ہی۔ مگر ایک پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ انسان کی سب سے بڑی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ پوپلر قسم کی چیز کو استعمال کرے۔ حد یہ کہ آج کل نوجوان صرف اس لڑکی کو پسند کر رہے ہیں جو پوپلر ہو۔ ورنہ سماج اس شخص کو آوٹ آف ڈیٹ سمجھ کر بلدیہ کی کنڈی میں پھینک دے گا۔

اور یوں بھی غور کیجئے کہ کیا وہ آدمی، آدمی کہلانے کا مستحق ہے جس کے پاس ایک

چپل بھی نہیں ۔

ابھی حال حال کی بات ہے کہ شہر کے ایک بڑے تاجر کی ساتویں لڑکی مس زرینہ کی شادی میں مجھے شرکت کا موقع ملا ۔ دعوت انتہائی پُرتکلف تھی ۔ کلکٹر، سکریٹری فوجی افسر، پولیس افسر اور منسٹر سے لے کر گورنر صاحب تک اس تقریب میں شریک تھے ۔ ڈنر کے بعد جہیز کے سامان کو نمائش کے لئے پیش کیا گیا جو تین بڑے ہالوں میں سجایا گیا تھا ۔ اسے دیکھنے کے بعد یوں لگا کہ میں کسی میوزیم میں بغیر ٹکٹ کے گھس آیا ہوں ۔ ہر شخص عش عش کر رہا تھا ۔

لیکن میرے ایک دوست نے کہا، بھئی! سب کچھ ٹھیک ہے مگر جہیز میں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے ۔

سب نے بڑی حیرانی سے پوچھا، وہ کیا؟

میرے دوست نے کہا، ہوائی چپل!

ایک دوسرے منچلے دوست نے تائید کرتے ہوئے کہا، بالکل ٹھیک ۔ لیکن ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے، اور وہ ہے فیملی پلاننگ پر ایک معقول کتاب ۔

اس پر سب ہنس پڑے ۔

بات ویسے مذاق کی تھی، لیکن میرے بے تکلف دوستوں نے بڑی سنجیدگی سے حالات کا اپنے انداز میں تجزیہ کیا تھا ۔ بظاہر فیملی پلاننگ کی کتاب اور چپل میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ کس طرح میرے دوستوں نے چپل کی پیداوار اور انسانی آبادی میں مطابقت پیدا کرنے کا ایک طریقہ بتایا ہے ۔ ورنہ ایک جمہوری ملک کے آزاد شہری کا اس سے بڑھ کر اور کیا المیہ ہوگا کہ وہ پیدائش کے ساتھ ہی ایک عدد چپل اپنے نام رجسٹر نہ کرا سکے ۔ اور عمر بھر ننگے پیر کھردری زمین پر چلتا رہے ۔

چوزہ

چوں چوں کرتا ہوا جو انڈے سے باہر آجائے اسے چوزہ کہتے ہیں۔ اور جو اندر ہی اندر رہ جائے اسے زردی کہا جاتا ہے۔

اور چوزہ بننے تک زردی کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اسے چوزے کی ماں یعنی مرغی خوب جانتی ہے۔ ویسے چوزہ جنم کے لئے اپنی ماں کا محتاج نہیں رہا۔ مشین ہی یہ فرائض انجام دے رہی ہے۔ لیکن اب تک دنیا میں کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو انڈے کو پیدا کر سکے!

یہ بالکل دوسری بحث ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی!

ہر دو صورتوں میں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انڈے کے بغیر مرغی کیسے آئی اور مرغی کے بغیر انڈا کیسے؟ اس سوال کا جواب دنیا کے کسی متفکر، فلاسفر نے آج تک نہیں دیا۔ اور اب تک یہ طے نہ ہو سکا کہ کس کو کس پر فوقیت حاصل ہے؟

ہٹائیے اسے۔ بات چوزے کی ہو رہی تھی۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ چوزہ صرف چوزہ ہوتا ہے، اور

اس کے سوا کچھ نہیں۔

چوں، چوں !

چوں، چوں !!

صحن میں کیا ہو یا گلی میں، چوزہ ہر ایک کی توجہ اپنی طرف پھیر لیتا ہے۔ اور دیکھنے والا بڑے پیار بھرے جذبے سے چوزے کی طرف نگاہ ڈالتا ہے۔

کبھی کبھی اسے چھونے کی اور اس پر ہاتھ پھیرنے کی بے پناہ خواہش دل کے کسی گوشے میں بیدار ہوتی ہے اور کبھی کبھی اسے دبوچ لینے کا جذبہ بھی جاگ اٹھتا ہے۔

چوں چوں ــ چوں چوں !!

اور یہ جذبہ اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب کوئی چوزہ گھر کی انگنائی اور گلی کو چھوڑ کر سڑک پر آجائے۔ اور وہاں اپنی باریک آواز میں گڑبڑ شروع کر دے۔

تب ایک ثانیے کے لئے ٹریفک جیسے جام ہو جاتی ہے اور کوئی پکار اٹھتا ہے ــ ہٹاؤ اس چوزے کو ــ !

چوزے کا سماجی زندگی میں کوئی پوزیشن نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر چوزہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کسی اونچی کرسی پر بیٹھے تاکہ اسے سب دیکھ سکیں۔ خود کو نمایاں کرنے کی یہ خواہش چوزے سے وہ سب کچھ کرواتی ہے جیسے ایک خوددار آدمی کبھی پسند نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر اگر کہیں جلسہ ہو رہا ہے تو چوزہ کی یہ نفسیات ہوگی کہ کسی طرح ایک بار یا ہو سکے تو دو بار یا اس سے زیادہ ممکن ہو تو ڈائس پر جلسہ اور مائک کے قریب سے گزر جائے۔ یا مائک پر آکر سامنے کی طرف گردن اکڑاتے ہوئے دیکھے، اور پھر ہلو ہلو کہے۔ جیسے کوئی میکانک، مائک کا ٹسٹ کر رہا ہو۔ جلسے کا ذکر ہی کیا اگر قبرستان میں بھی چوزے کو جانے کا موقع ملے تو وہ کھدی ہوئی گہری قبر میں جھانک کر کہے گا، تو بہ بھئی ــ حضرات! ذرا دیکھئے تو یہ قبر کتنی اتھلی ہے اور کتنی تنگ !

چوزے کے اس ریمارک پر ظاہر ہے، سب چونک کر اسے دیکھیں گے اور ایک ہی ثانیے میں وہ سب
کا موضوعِ بحث بن جائے گا۔ اور ساتھ ہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ سب کے چہروں پر آجائے گی۔
اور اس کا مطلب ہوگا، چوزے صاحب! ابھی آپ انڈے میں کی زردی ہیں۔ اتنی بڑی بڑی باتیں
آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ لہٰذا آپ خاموش رہئے۔

اس طنزیہ مسکراہٹ کا چوزہ برا نہیں مانے گا۔ بلکہ اس پر وہ خوش ہوگا۔

جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا کہ چوزہ خود کو نمایاں کرنے کے لئے بڑی عجیب اور مضحکہ خیز حرکتیں
کرتا ہے۔ اپنی انا کی تسکین اور شخصیت کو منوانے کے لئے چوزے کے یہ طریقے بڑے عام ہیں۔
اس کی یہی ایک تکنیک ہے جو وہ ہر جگہ برتتا ہے۔

میں نے اب تک قسم قسم کے سیکڑوں چوزے دیکھے ہیں۔ اور ان کے تعلق سے ایک
ہی بات نوٹ کی ہے۔ اور وہ یہ کہ کوئی چوزہ اپنے ساتھی چوزوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا محض
اس لئے کہ اس عمل سے اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا ہر چوزے کی یہ کوشش رہے گی
کہ وہ ان کے ساتھ رہے جو عمر میں، جسمانی قد میں، اور ذہنی قد میں بھی اس سے بہت اونچے ہوں۔
اور اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ چوزہ کا قد اور چھوٹا ہوجاتا ہے۔ اور اس کی شخصیت اُبھر کر سب
کے سامنے آجاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ چلنے کی بجائے پھدکنے لگتا ہے۔

کوفت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی چوزہ اپنی گردن کو اکڑا کر سر اٹھاتا ہوا بانگ دینے
کی کوشش کرتا ہے۔

ککڑ کوں کوں ــ ککڑ کوں کوں ــ کوں!!

اور کوئی مرغ دور بیٹھا ہوا چوزے کی اس ناکام کوشش پر مسکراتا رہتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ دنیا کے کسی ملک نے چوزے کو اپنا قومی جانور نہیں بنایا۔ حالانکہ
چوزے میں وہ ساری صفات موجود ہیں جو ایک بہادر جانور میں ممکن ہیں۔ قابلِ تعریف بات یہ
ہے کہ چوزہ کبھی اپنا رنگ نہیں بدلتا۔ اور نہ دنیا کے کسی چوزے کے تعلق سے یہ بات سننے میں آتی

ٹانسلس

اگر آپ نے کسی کو سلام کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھایا ہے اور وہ جواب میں مکھی اڑا دے یا مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا ہے اور وہ گردن اکڑا اکڑ چل دے تو فوراً آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے ٹانسلس بڑھ گئے ہیں۔

قصور اس میں اس کا نہیں بلکہ ان بڑھے ہوئے ٹانسلس کا ہے جو اس کے گلے کو اس حد تک موٹا کر دیتے ہیں کہ گردن پر چربی کی تہیں دن بہ دن بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ زمین کو دیکھ کر چلنے کی بجائے آسمان کو دیکھ کر چلنے لگتا ہے۔

اور زمین کراہ اٹھتی ہے!

بڑی بوڑھیاں بلبلا اٹھتی ہیں!!

اور ماؤں کی کوکھ جیسے اندھی ہوجاتی ہے!!!

ایک ایسے ہی لمحے میں نے ایک معمر خاتون سے کہا، بوڑھی ماں اب تم اپنے بیٹے کا خیال چھوڑ دو، کیونکہ اس نے تمہیں بھلا دیا ہے، اور اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اس کی بھی کوئی ماں تھی جس نے اسے پڑھایا اور اس مقام تک پہنچایا۔ اب وہ نہیں چاہتا کہ اپنی گوری چٹی بیوی کو چھوڑ کر بیڈ روم کے باہر کی دنیا میں قدم رکھے۔ اور اسے آنا بھی نہیں چاہیے، ورنہ اس کی آمد سے فائدہ ہی کیا ہوگا، کیونکہ اسے اپنی سویٹ لیلی کے سوا دنیا کی کوئی شے نظر نہیں آتی۔

پتھر کی بڑھیا مجھے حیران نظروں سے تکنے لگی۔ لیکن اس کے بوڑھے شوہر اللہ بخش نے بات کو سمجھتے ہوئے صرف "ہوں" کہا۔ اور پھر کھانس کر اپنے گلے کو صاف کیا اور پوچھا "صاحب! اس کا علاج ——؟

لفظ علاج کے ساتھ ہی بوڑھیا میری طرف متوجہ ہو گئی

اب میاں بیوی دونوں کے چہروں پر امید کی ایک ہلکی سی کرن تھی۔ جیسے مرنے والے کے کان میں آہستہ سے کہہ دیا جائے کہ اب بھی وہ بچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس نسخے کو استعمال کرے جو اس کے لئے تجویز کیا جائے یا جو زیر تجویز ہے۔

میں نے کہا ٹانسلس ایک بیماری کا نام ہے، ویسے یہ متعدی نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی انفکشن سے بھی یہ پیدا ہوتی ہے۔ اگر مریض کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہو تو اچھا خاصا آدمی بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ گویا یہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہوتی ہے۔ جیسے ہی بچہ یا بچی تیس سال کی عمر کو پھلانگ کر آگے بڑھ جاتی ہے یا بڑھ جاتا ہے وہ گویا خطرے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح اکیس برس اگر وہ اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ مستقبل محفوظ ہے۔

بیماری کی صورت کیا؟ تیز بخار کا حملہ ہوتا ہے، حلق میں تکلیف رہتی ہے اور غذا کا نگلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں اگر مرض میں شدت پیدا ہو جائے تو سانس کا لینا بھی ایک مہم سر کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اس کا واحد علاج آپریشن ہے، ورنہ مریض کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ ویسے ٹانسلس کا آپریشن بہت ہی معمولی سمجھا جاتا ہے۔ اور مریض ریڈیو سیلون کا فلمی پروگرام

سنتے ہوئے خوشی خوشی اس مرحلے سے گزر جاتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں یہ مرض لاعلاج ہے۔

آزادی سے پہلے یہ مرض نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں، راجاؤں اور بادشاہوں کی حد تک محدود تھا۔ اور ہمیشہ ان کی گردن اکڑی رہتی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد یہ وباء عوام میں پھیلنے لگی۔ اور آج کل اس کی حیثیت متعدی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالروں کا خیال ہے کہ ہر چار میں تین اس موذی مرض سے متاثر ہیں۔ اور اب نانسلس نے ہمارے ملک میں ایک قومی بیماری کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور جب کوئی بیماری قومی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو وہ بیماری نہیں رہتی بلکہ ایک تحریک بن کر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں گلی گلی!!

سنا ہے کہ یہ تحریک ہندوستان سے باہر بھی بڑے زور و شور سے چل رہی ہے۔ لیکن ابھی قطعی طور پر کوئی یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ یہ تحریک دیسی ہے یا بدیسی۔ البتہ اس کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ضرور یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ ایک "انٹرنیشنل نانسلس ایسوسی ایشن" قائم کی جائے۔ صدر دفتر واشنگٹن میں کھولا جائے۔ کیونکہ امریکہ اس کے لئے بہت موزوں ہے۔ البتہ جنابِ صدر کا انتخاب ایشیا کے کسی پچھڑے ہوئے ملک سے کیا جائے اور اس کی شاخیں اس خطہ ارض کے ہر اس حصے میں ہونی چاہئیں جہاں انسان رہتا بستا ہے۔ ممبرشپ کے لئے کوئی قید نہ رکھی جائے۔ ہر بالغ مرد اور عورت کے لئے اس کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے۔ موٹی گردن والے حضرات بغیر کسی رکنیت کی فیس کے قبول کئے جائیں۔ اور انھیں اس بات کی آزادی دی جائے کہ "وجودیت" کے فلسفے پر جو دل میں آئے جہاں چاہے اور جس طرح چاہے اظہار خیال کریں۔ ان کا فرمایا ہوا مستند سمجھا جائے۔

نالسن سے ناجائز تعلق خواہ ادب میں ہو یا سماجی زندگی میں، ہمیشہ گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔

آپ ہی کیا، ہر حساس آدمی 'میں ہیں' کی تکرار سے زچ ہو جائے گا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس تحریک کے مینی فسٹو میں اسی ایک لفظ کے سوائے کچھ نہیں ملتا۔

اگر نام نہاد انٹلکچوئیلس معاف فرمائیں تو میں عرض کروں کہ اس تحریک سے متاثر ہونے والوں میں اکثر ایسے ہیں جو محض اس لئے اکڑ کر چلتے ہیں کہ انھوں نے اپنے قلم کی روشنائی کو کاغذ پر پھیلانا سیکھ لیا ہے، ورنہ حلیے اور عادات کے اعتبار سے ان کا مجموعی رویہ زندگی کے تعلق سے سرکس کے مسخروں سے کم نہیں ہوتا۔

ابھی حال حال کی بات ہے کہ ایک نوجوان افسانہ نگار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے خلوص کے ساتھ چائے کے لئے مدعو کیا۔ ہوٹل لے گئے اور اپنی پہلی تخلیق کو جسے لکھے ہوئے دس سال گزر چکے میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا، اس کہانی کو پڑھئے۔ اسے لکھ کر میں نے اردو ادب میں ایک نیا موڑ پیدا کیا ہے۔

موڑ والی بات پر میں چونک گیا۔ شاید آپ بھی چونک گئے ہوں۔ ظاہر ہے چونکنے کی بات ہی تھی۔ میرا اشتیاق بڑھا اور میں نے پوری توجہ کے ساتھ کہانی کو پڑھا۔ لیکن کہانی میں نے موڑ والی بات مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ کہانی میں عورت کی پنڈلیوں، رانوں اور کولھوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے اس نوجوان سے کہا، بھائی میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ آخر آپ اس کہانی کے توسط سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ عورت کی پنڈلیاں اور کولھے آپ نے دکھائے، اچھا کیا، لیکن دکھا کر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ــــ کیا بتانا چاہتے ہیں؟

نوجوان افسانہ نگار اپنی لمبی لمبی زلفوں کو جھٹکے کے ساتھ پیچھے کرتے ہوئے اٹھا اور سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچ کر ہوٹل کی چھت کی طرف دھویں کو پھونکتے ہوئے اس نے کہا آپ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ غلطی میری تھی جو میں نے آپ سے پوچھا، حالانکہ میرے دوستوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کے یہاں نہ جاؤں۔ آپ میں نئے ادب کو سمجھنے کی وہ حس ہی نہیں ہے۔ میں نے جو سمبلس استعمال

کئے اسے صرف میرا ذہین قاری سمجھے گا۔

ساتھ ہی وہ ہوٹل کا بل ادا کئے بغیر چلا گیا۔ چائے کے پیسے مجھے دینے پڑے۔

ایسی صورت میں اگر اللہ بخش کا بیٹا اپنے باپ کو بھول گیا ہے۔ اور ماں کو پلٹ کر نہیں دیکھتا تو کون سی حیرت کی بات ہے اور نہ یہ آج کا المیہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو ماں باپ کی جوانی کی ایک بھول سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں اسے پیدا کر کے اس کے ماں باپ نے اس پر کچھ احسان نہیں کیا۔ تو پھر کیوں ان کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو پریشانیوں میں مبتلا کرے۔

اجتماعی سطح پر یہ ایک عالمگیر تحریک ہے۔ اس لئے اللہ بخش کا غم صرف اللہ بخش کا غم نہیں بلکہ ایک باپ کا غم ہے اور ایسے کئی اللہ بخشوں کے غم کو سامنے لاتا ہے۔ جو اپنی ہی اولاد کے بے رحم ہاتھوں سے روز قتل ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ بخش کو کون سمجھائے کہ اس کا علاج دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس ہے اور نہ کوئی عدالت اس کے بیٹے کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کر سکتی ہے۔
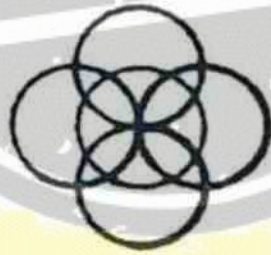
گھی کا بابو

گھی کا بابو بچے بیحد شوق سے کھاتے ہیں، اور بڑے بھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچے کھاتے ہوئے نہیں شرماتے اور بڑے . . . . !

بڑے کھاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ پہلے تو وہ سب کے سامنے نہیں کھائیں گے! اور کھائیں گے بھی تو یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیں گے کہ وہ گھی کا بابو کھا رہے ہیں۔ اگر ریڈ ہینڈ پکڑے گئے تو اس طرح شرمندہ ہوں گے جیسے واقعی وہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

گھی کا بابو اور حلوہ سوہن کی پٹی میں فرق یہی ہے کہ ایک میں دانتوں کی آزمائش ہے اور دوسرے میں نہیں۔ اس طرح جوان اپنے مضبوط دانتوں کی قوت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بوڑھے گھی کا بابو کھاتے ہوئے حلوہ سوہن کا تصور کرتے ہیں۔ اور ماضی کے ان لمحوں کو یاد کر لیتے ہیں، جب کہ وہ جوان تھے۔

گمی کا بابو اور حلوہ سوہن کے بیچ میں ایک نسل کا فاصلہ ہے۔ اس لئے ان کے ملنے کے پتے بھی مختلف ہیں۔ ایک حلوائی کی دکان پر ملتا ہے اور دوسرا گلی گلی کوچہ کوچہ۔

ذائقہ میں کہا جاتا ہے کہ گمی کے بابو کا جواب نہیں ہوتا۔ بس منہ میں ڈالئے آئسکریم کی طرح گھلنے لگے گا اور حلوہ سوہن تو دانتوں کی ایک ورزش ہے۔ ویسے بھی بعض کا خیال ہے کہ کبھی اونچ نیچ ہو جائے تو شہر میں ڈنٹسٹ کی کمی نہیں۔

مٹھاس کے بارے میں ہماری دو رائیں نہیں ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بہت سے حضرات طبیعتاً آرام پسند واقع ہوتے ہیں۔ ورزش انھیں کسی حال پسند نہیں۔ اس لئے ....!

گمی کا بابو صرف دکانوں کے شوکیس یا چھوٹے بڑے شیشوں میں بند پڑا نہیں ملتا بلکہ یہ عام قسم کے انسانوں میں دستیاب ہوتا ہے۔ ہنستا ہوا، بولتا ہوا، باتیں کرتا ہوا۔ اور اس کی بھی وہی خصوصیت ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔

میٹھا میٹھا — نرم نرم — آئسکریم جیسا —!

لیکن اس کی پہچان ذرا مشکل ہے —!

سلام کے بعد مصافحے کے لئے اتنا جھک جائے گا جیسے کوئی اطاعت گزار بندہ نماز میں بہ حالت رکوع ہو۔ اس کے بعد کی منزل ظاہر ہے کہ سجدے کی ہوتی ہے۔ ہر بات کا جواب اثبات میں دے گا۔ اور مسکراتا ہوا جی ہاں، جی ہاں اس طرح کہتا ہوا جائے گا جیسے اس کے علاوہ وہ کوئی اور لفظ سے واقف نہیں۔ گفتگو کے دوران اس طرح ادب سے کرسی کی انی پر بیٹھا رہے گا کہ مخاطب کے دل میں یہ احساس جاگ جائے گا کہ دنیا کی ساری عزت و تکریم صرف اسی کے لئے ہے ورنہ قیام کی حالت میں بات چیت جاری ہے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح باندھے گا جیسے کوئی ادنیٰ خادم کسی بادشاہ یا شہنشاہ کے حضور میں کھڑا ہے۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ کسی بھی حیثیت میں گمی کے بابو کے لئے مفید ہوں۔ یا نہیں تو مستقبل قریب یا بعید میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یا کم از کم اپنے میدان کی ایک با اثر شخصیت ہوں۔ کیا جانے

آپ سے کب، کس قسم کا کام پڑ جائے ۔ ورنہ ان سارے امکانات سے اگر آپ کی شخصیت پرے ہے تو وہ اسی طرح آپ کے قریب سے گزر جائے گا جیسے کوئی اجنبی ہو ۔

اور اپنی جگہ آپ بل کھا کر، تڑپ کر یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ کیا ایسا ممکن ہے ۔؟ کہیں آپ کی آنکھوں نے آپ کو دھوکہ تو نہیں دیا ۔

ویسے آپ کے ان تمام سوالوں کا جواب جنیٹک اکسپرٹ کے پاس ہے ۔ جنیٹک ایک بیحد دلچسپ مضمون ہے جس میں آدمی کا یا کسی جاندار کے تاریخ جغرافیہ پر ہی غور نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی ترچھا ہے تو پتہ لگایا جاتا ہے کہ اس کے ننھیال یا ددھیال میں کون ترچھا تھا ۔ اگر دونوں شجروں میں کوئی نہ نکلا تو شبہ کا فائدہ دیئے بغیر چارہ نہیں ۔ ورنہ امن عامہ کو خطرہ بہرحال باقی رہتا ہے ۔

گھی کے بابو کی شخصیت بڑی آفاقی ہے ۔ یہ ہر قوم اور ہر ملک میں پیدا ہوتا ہے ۔ خاص طور پر ہمارے ملک ہندوستان جنت نشاں میں اس کی آبادی دن بدن بڑھتی جاتی ہے کیونکہ اس کی پیدائش اور صحت کے لئے یہاں کی آب و ہوا بے حد مفید ہے ۔ آج کل یہ عرب ممالک اور خلیجی ریاستوں کو بھی برآمد کیا جا رہا ہے ۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ ہر جانے والا گھی کا بابو نہیں ہوتا ۔۔۔!

گھی کے بابو کی شخصیت کا ایک پہلو نہیں بلکہ کئی پہلو ہیں ۔ کبھی وہ مسکینی کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے ۔ کبھی فرعونیت کا چہرہ لگا کر اور کبھی لمبے لمبے بالوں میں اپنے چہرے کو اس طرح چھپا لیتا ہے کہ دور سے عورت کا دھوکہ ہوتا ہے ۔ اور یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مرد ہے یا عورت ۔ یا پھر مرد اور عورت کے بیچ کی کوئی جنس جو ہوتی ہی نہیں ۔ لیکن گھی کے بابوؤں میں ایک قدر مشترک ہے ۔ اور وہ ہے ان کی زن مریدی ۔

بات جب یہاں تک پہنچی ہے تو چھپانے سے حاصل ہی کیا ۔ اور یوں بھی یہ کوئی ایسی بات تھوڑی ہی ہے جسے راز میں رکھا جائے ۔ گھی کے بابو کی یہ خصوصیت بڑی مثالی قسم کی ہے ۔ جہاں بھی آپ یہ دیکھیں کہ کوئی اچھا خاصا بھلا آدمی اپنی بیوی کی ساڑی یا بلوز کو دھو رہا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ

وہ جورو کا غلام ہے۔

اصل میں ساڑی یا بلوز دھونا غلامی پر دلالت نہیں کرتا۔ ایسے ہی جیسے کوئی اچھی بیوی اپنے شوہر کی قمیص یا پتلون دھوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے اپنے شوہر کے حق میں غلامی کا پٹہ لکھ دیا ہے۔ بالکل اسی طرح شوہر کے تعلق سے بھی یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ کیونکہ میاں اور بیوی زندگی کے وہ رفیق ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے سکھوں میں شریک نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے غموں اور مصیبتوں کو بھی آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شوہر بیوی کی ساڑی دھونا اور اس کی سینڈل کی گرد صاف کرنا ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل سمجھتا ہے' تو بتائیے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جورو کا غلام ــــ!

ایک آپ ہی نہیں سب یہی کہیں گے ــــ!

میرا بھی یہی خیال ہے کہ گمی کا بابو یا گمی کے بابو قسم کے لوگ صرف اپنی بیوی کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بیوی کی نوکرانی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن یہ اہمیت دوسری قسم کی ہے۔ اور وہ کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں چلنے دیتے۔ یہاں تک کہ بیوی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ لیکن گمی کے بابو والی خصوصیت سو فیصدی بیوی کو خوش کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ حد یہ کہ وہ اپنی بیوی کی نوکرانی کی ساڑی بھی دھونے میں دریغ نہیں کرتے اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ ان کے اس عمل سے بیوی خوش ہو جائے گی۔

بیوی کے بھائی اور ماں باپ اور دیگر افرادِ خاندان کا تو کچھ نہ پوچھیے۔ وہ اس طرح انھیں اپنے سر پر اٹھائے اٹھائے پھریں گے جیسے ــ جیسے ــــ اب ہٹائیے' تشبیہ میں کیا رکھا ہے۔ صرف یہی کہنا مقصود تھا کہ زن مریدوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ وہ جو دنیا کی کسی حسینہ نے کہا تھا:

'مجھے چاہو اور مجھ سے پہلے میرے کتے کو چاہو'

تو اس مشہور فقرے کا کلائمکس یہ ہے کہ محبت کتے سے شروع ہوتی ہے، اور کتے پر ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ چاہنے والا کتے کی مالکہ تک پہنچنے ہی نہیں پاتا۔ پہلا ہی امتحان اتنا سخت ہوتا ہے کہ کتے کے کاٹنے سے بھونک بھونک کر مر جاتا ہے۔ اگر مرتا بھی نہیں تو آخر دم تک بھونکتا رہتا ہے۔ اور اس کی آواز محلے والے سنتے رہتے ہیں۔

ایسے لاعلاج عاشق بے چارے شوہروں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سنا ہے کہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس اس کا علاج نہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں بھی زن مریدوں کی ایک قسم میں شمار کر لیں۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔

البتہ میں آپ کی توجہ ضرور ان اطاعت گزار شوہروں کی طرف منعطف کراؤں گا جن کی بیویوں کی اجازت کے بغیر گھر کا پتہ بھی نہیں کھڑکتا۔ یہاں تک کہ وہ ـــــ!

اب میں کیا عرض کروں۔ میرا اشارہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہیں۔

گھی کے بالوؤں کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو دیکھنے میں جلے کٹے اور بیویوں کے حق میں جلاد نظر آتے ہیں۔ لیکن کمرے کے اندر یہ سب اپنی بیویوں کے پیر ہی نہیں پڑتے بلکہ گھنٹوں ان کے تلوے سہلاتے بیٹھے رہتے ہیں۔

اب آپ ان سے پوچھئے کہ تلوے کیوں سہلاتے ہیں؟ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ آپ کچھ نہ پوچھیں۔ ورنہ ان کی سماجی پوزیشن نازک ہو جائے گی۔ اور آپ کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

لبرل قسم کے گھی کے بالو وہ ہوتے ہیں جو نشے میں دھت اپنی بیوی کا دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور دوسرے کی بیوی کو اپنی بیوی سمجھ کر جب بانہوں کو پھیلاتے ہیں تو انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی نے ان کے منہ پر ایک زوردار چانٹا رسید کیا ہے۔ تب ان کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اور وہ معافی چاہ کر اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے پھر کسی بار کے اندر گھس جاتے ہیں۔

لیکن وہ گھی کے بابو کسی مصروف اور ہمیشہ مسکرانے والے سوشیل ورکر کی طرح بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں جو اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کسی دوسرے دوست کی کار، رکشا یا کسی بھی سواری میں بٹھاتے ہیں۔ اور اس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بازار جاکر اپنی بھابی کو شاپنگ کرا دے۔ کیونکہ وہ بے حد مصروف ہیں۔ اور انھیں شہر کے آخری کونے میں ایک پبلک میٹنگ کو مخاطب کرنا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سوشیل ورکر صاحب کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کی بیوی کس دوست کے گھر میں ہے۔ اگر انھوں نے اپنی پارٹی کے سالانہ جلسے کے وقت اپنی بیوی کو زید کے حوالے کیا تھا تو وہ دوسرے سالانہ جلسے کے بعد بکر کے گھر سے برآمد ہوتی ہے۔

یہ وہ ہوتے ہیں جن کی بیویوں کی تعریف میں صرف پڑوسی ہی نہیں بلکہ اہلِ محلہ اور اہلِ شہر بھی اپنی زبان نہیں سکھاتے۔ اور ایسے حضرات اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی بیویوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

اور یہ ان کی بیویوں کی مہربانی ہے کہ بچوں کی ولدیت میں ان کا نام ضرور شامل کرتی ہیں۔ ورنہ وہ اگر حق گوئی پر اُتر آئیں تو سماجی اور سوشیل زندگی میں ایٹمی دھماکہ ہونے میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔

آخر میں ایک بات گرہ میں باندھ لینی چاہئے کہ ہر زن مرید گھی کا بابو نہیں ہوتا۔ لیکن ہر گھی کے بابو کا زن مرید ہونا ضروری نہیں، لازمی ہے۔
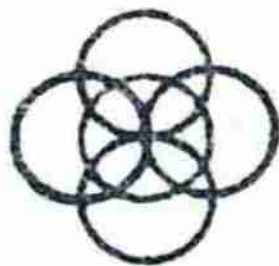
چمچے

چمچے سے کون واقف نہیں ــ!

دستر خوان کی ساری بہاریں چمچے سے عبارت ہیں۔ اس کے بغیر نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ صورتِ حال اتنی نازک ہوجاتی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے میزبان کا یا اس شخصیت کا منہ دیکھتے رہیے جس نے آپ کے سامنے سب کچھ تو رکھ دیا اور اگر نہیں رکھا تو صرف چمچہ۔ سچ پوچھیے تو چمچہ دستر خوان کا ایک ہتھیار ہی نہیں بلکہ آج کے انسان کا وہ ہاتھ ہے جس کے بغیر اس کے دونوں ہاتھ بے کار ہوجاتے ہیں۔

ہم سب ہی جانتے ہیں کہ چمچے کا ہماری زندگی میں کتنا اہم موقف ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ کس طرح دستر خوان کا یہ چمچہ ہماری زندگی میں گھس آیا ہے۔

اور قدم قدم پر اس سے واسطہ پڑتا ہے۔

بھائی! وہ تو چمچہ ہے چمچہ —!

چمچے کے چلے جانے کے بعد ہمارا کوئی بھی خواہ بڑے رازدارانہ انداز میں مسکراتا ہوا جیسے خطرے کی گھنٹی بجاتا ہے، اور ہمیں اپنی ازلی شرافت پر کوفت ہوتی ہے کہ کھلے دل کے ساتھ ساتھ نہ جانے ہم نے کیا کیا اس سے کہہ دیا۔

ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ پہلی بار ہماری ملاقات کس چمچہ سے ہوئی اور کیسے ہوئی؟ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ لفظ چمچہ پر ہمیں بڑی کوفت ہوئی۔ اور ہمیں احساس ہوا کہ اچھے خاصے لفظ کی مٹی پلید کی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور خیال ہمارے احساس کی تہہ میں برقی رَو کی طرح گزر رہا تھا کہ اس سے اچھا اور مناسب کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا۔ جس شخص نے بھی یہ نام دیا ہے وہ غیر معمولی ذہین ہوگا۔ اس کا پتہ چلانا چاہئے۔ اور اس پر مضامین لکھ کر یا لکھوا کر کھلے دل کے ساتھ اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص تو اس دنیا میں نہیں ہوگا، صرف اس لئے کہ یہ نام ایک طویل عرصہ سے ایک سکّے کی طرح بازار میں چل رہا ہے۔ لہٰذا شخص مذکور کے ورثاء کی خدمت میں ایک کیسۂ زر پیش کرنا چاہئے۔ اور اگر ممکن ہو تو اس پر ایک ڈاکومنٹری فلم بھی تیار کی جانی چاہئے۔ تاکہ ہمارے عوام زیادہ سے زیادہ اس سے واقف ہوسکیں۔ ظاہر ہے یہ ایک خیال تھا جو ایک رَو کی طرح گزر نہیں گیا بلکہ امر بیل کی طرح احساس کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا۔ آج بھی ہم جب سوچتے ہیں تو ہمیں اپنے اس منصفانہ رویے پر خوشی ہوتی ہے۔

واقعی وہ شخص بڑا ہی ذہین ہوگا جس نے چمچہ ازم کو آگے بڑھایا اور اس کے اغراض و مقاصد کو پبلک کے سامنے پیش کیا۔ یا پھر وہ اس صدی کا پہلا چمچہ ہوگا جس نے اس ازم کے فاؤنڈر سے ہاتھ ملا کر اس کے ہاتھ مضبوط کئے۔

آج اس ازم کو ماننے والے سینکڑوں افراد اس ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ویسے اس ازم

کی اتنی مقبولیت کے باوجود بھی اس کا اپنا کوئی لٹریچر نہیں ہے۔ اور نہ الکشن کے زمانے میں اس
کے کسی اُمیدوار نے اپنا مینی فیسٹو چھاپ کر انتخابات لڑنے کی کوشش کی۔ اس کی بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ اس میں بلالحاظ مذہب و ملت اور فرقہ اس کے ممبر آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ ان کا پہچاننا بڑا
مشکل ہے، کیونکہ ان کا اپنا نہ کوئی نام ہوتا ہے نہ کردار، اور نہ چہرہ۔ دوسرے الفاظ میں مختصراً
اس کے ماننے والے کسی فرد کی تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ چمچہ وہ شخص ہوتا ہے جس کی اپنی کوئی
انفرادیت نہیں ہوتی۔ اور جو اپنے منہ میں دوسرے کی زبان فٹ کر لیتا ہے۔ اور ایک لاوڈ اسپیکر کی
طرح کسی نظر نہ آنے والے شخص کی آواز کو دُور دُور تک پہنچاتا رہتا ہے۔ جس طرح لاوڈ اسپیکر کرایہ پر
ملتے ہیں بالکل اسی طرح چمچے بھی کرایہ پر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پر مستقل
طور پر خریدے بھی جا سکتے ہیں۔ یہ بات افراد کے تعلق سے نہیں قوموں اور ملکوں کے بارے میں بھی
کہی جا سکتی ہے۔ بڑا ملک اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر چھوٹے ملکوں کو اپنا چمچہ بنا لیتا ہے، یا
بعض وقت چھوٹی طاقتیں اپنی بقا کی خاطر بڑی طاقتوں کو سجدہ کرنے لگتی ہیں۔ یقین نہ آئے
تو آپ یونائیٹڈ نیشنز کے جنرل سکریٹری سے ربط پیدا کیجیے۔ آپ حقیقی صورتِ حال سے واقف
ہی نہیں ہوں گے بلکہ آپ کے سامنے صحیح اعداد و شمار آئیں گے۔

آپ کو یہ پڑھتے ہوئے مایوسی ہوئی ہوگی کہ میں بجائے دسترخوان کے چمچے کے کسی اور چمچے کی
بات کر رہا ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ دسترخوان کے باہر بھی زندگی
اور سماج کی ہر سطح پر چمچے پھیلے ہوئے ہیں۔ چھوٹے بڑے چمچے۔

اور ہم چمچے ہر چھوٹی بات کے لیے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ اگر گھر میں
لڑائی ہو تو اس کی گونج جنرل اسمبلی میں سنائی دیتی ہے۔ بات بڑی جمہوری ہے۔ لیکن یہ اُس
پنچایتی ذہن کو سامنے لاتی ہے جو دو اور دو چار کی اصطلاح میں سوچتا ہے۔ حالانکہ زندگی
اور اس کے مسائل ریاضی کا کوئی فارمولا نہیں ہوتے۔

چمچے کے بغیر زندگی کے کسی شعبہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں بھی جائیے وہاں آپ کو ایک چمچہ ملے گا۔ یہ انشورنس کمپنی کے اس ایجنٹ سے بڑا مشابہ ہوتا ہے جو وقت بے وقت کینولینگ کے لئے تُل جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انشورنس کے ایجنٹ کی بڑی کاروباری، اور خوشامدانہ زبان ہوتی ہے اور چمچے کی زبان بڑی گول مول قسم کی۔ اس لئے چمچے کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس چمچے کو جو تہذیبی اور سیاسی میدان میں کام کرتا ہے۔ سی آئی ڈی کے آدمی کو پہچاننے میں شاید دیر لگ جائے لیکن چمچے کو پہچاننے میں عمر عزیز بھی کافی نہ ہو۔ ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی انڈر گراونڈ کام کرتا ہے۔ اور چمچہ کھلے بندوں۔

اب آپ اپنے آس پاس نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ آپ کتنے چمچوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں۔ ویسے گھریلو اور نجی زندگی میں بھی آپ کو چمچے ملیں گے جو بڑی آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ کبھی گھر کی ماما، صاحب خانہ کا چمچہ بن جاتی ہے اور کبھی گھر کی مالکن موٹر ڈرائیور کا۔ اور کبھی خود صاحب خانہ بہ نفس نفیس اپنی بیوی کا چمچہ بن جاتا ہے۔ اور چمچہ بننے کے بعد اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر دیکھتا بھی ہے تو بیوی کی آنکھ سے۔ یہی نہیں بلکہ وہ بیوی کے دماغ سے سوچتا ہے، بیوی کی زبان میں بات کرتا ہے۔

غرض کہ کوئی شئے اس کی اپنی ذاتی نہیں ہوتی۔ البتہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح اس کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل اس کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر بھی یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا؛ کون جانے یہ بھی اس نے کسی سے مستعار لیا ہو ــــ!

گھر کے باہر اگر آپ عوامی اور تہذیبی زندگی میں چمچوں کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کریں تو آپ کو وہی دقت ہوگی جس کا ذکر ابھی کچھ دیر پہلے میں نے آپ سے کیا ہے۔ بڑی محنت کے بعد اگر آپ نے یہ مہم بھی سر کرلی تو کوئی دعوئی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کب، اور کس وقت

کسی کا چمچہ کسی اور کا چمچہ بن جائے۔ چمچہ بننے اور چمچہ بنانے والوں کا کاروبار بڑا وسیع ہے۔ کوئی چاہے تو کسی کو اپنا چمچہ بنالے اور کوئی چاہے تو کسی کا چمچہ بن کر اپنی زندگی گزار دے۔ اپنا اپنا شوق ہے۔ لیکن یہ بات اسے کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ وہ پہلے انسان ہے، اور انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔
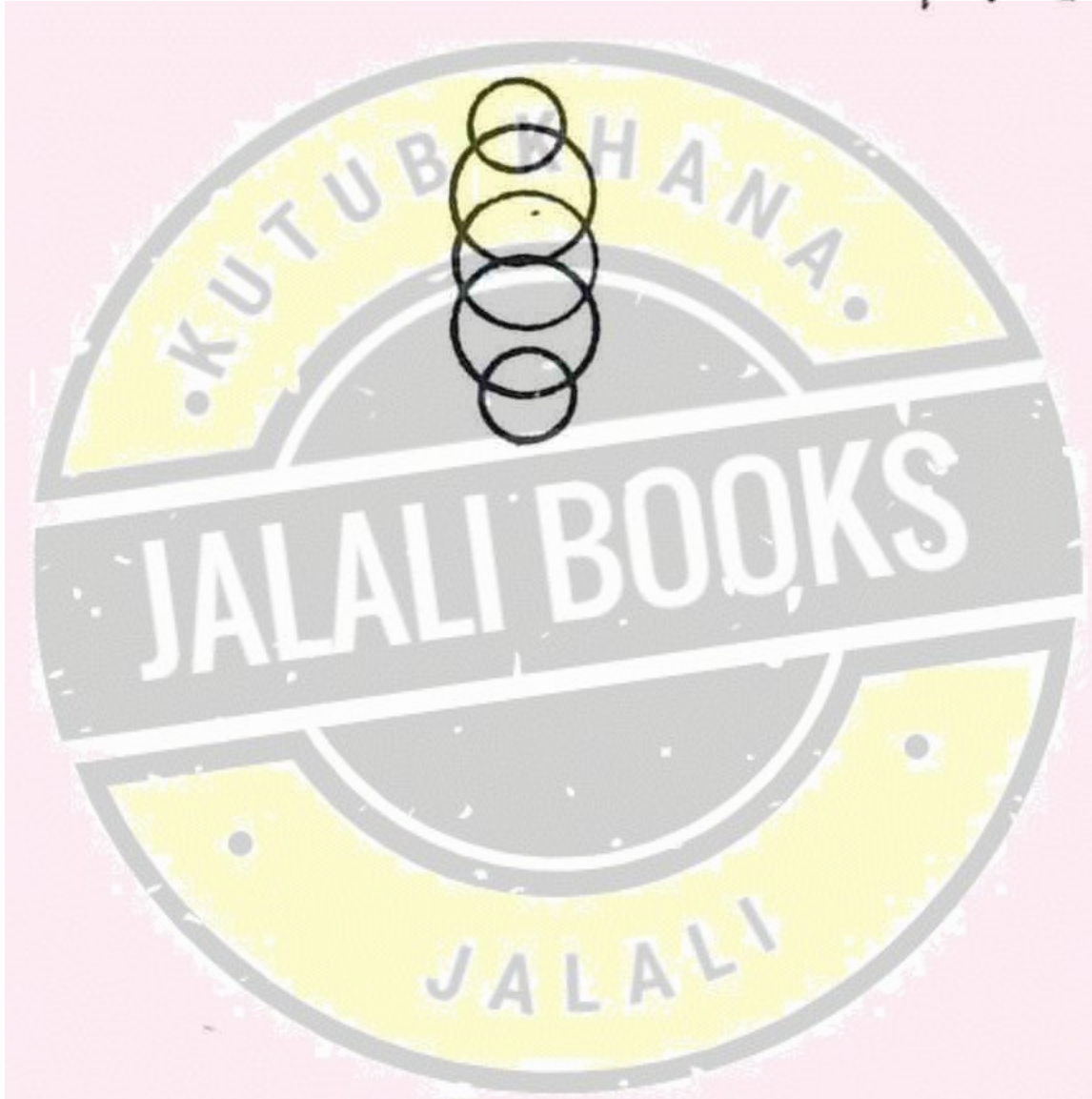
واک آؤٹ

واک آؤٹ کی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں کوئی اہمیت ہو تو ہو لیکن پبلک کے پاس یعنی عوام کے پاس کچھ نہیں ۔ ان کے لئے تو واک آؤٹ ایک کھیل ہے ۔ یا ایک ایسی بات جیسے کوئی خفا ہو کر کھانا نہ کھائے ۔ یا پھر غصہ میں آکر اپنے پیر پٹکنے لگے ۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ پیر پٹکنے اور تالی بجانے میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ اکثر لوگ اس نازک فرق کو بھول جاتے ہیں ۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے حضرات تالی بجانے لگتے ہیں اور عورتیں پیر پٹکنے لگ جاتی ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ پہلے مردوں کا تالی بجانا معیوب سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کل عورتوں کا تالی بجانا بُرا سمجھا جا رہا ہے ۔ اس لئے پیر پٹکنے والی خواتین ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے مقابلوں میں حصہ لے رہی ہیں اور مرد بیڈمِنٹن کھیل رہے ہیں ۔

ویسے نازک کھیلوں سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں میں چوٹ نہیں آتی ۔ یہاں تک کہ کلائی میں بھی موچ کا امکان کم ہوتا ہے ۔ لیکن لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں ہمیشہ کولھے یا پیر

کے فریکچر کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے خواتین ہائی جمپ کے بعد کسی کلینک کا رُخ کرتی ہیں وہ نارمل حالات میں سستانے کے لئے کسی ہوٹل یا پکچر ہاؤس میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اور مرد بے چارے بیڈمنٹن کے بعد چولھے کی آگ سے اپنے نرم نرم ہاتھوں کو سینکتے ہیں۔ ظاہر ہے مرد کے لئے یہ لمحہ بڑا ہی جان لیوا ثابت ہوتا ہے جب وہ بیوی کی غیر حاضری میں کچن کا انچارج بن جائے۔ اور مُنّا یا مُنّی کو بجائے دودھ کے چاول کی پیچ پلائے۔ اور اس سے زیادہ نازک اور جان لیوا لمحہ وہ ہوتا ہے جب بیوی رات کے ایک بجے سیکنڈ شو دیکھنے کے بعد تھکی تھکائی گھر میں داخل ہوتی ہے۔ اور شوہر اسی لمحہ اور اسی دروازے سے گھر کے باہر چلا جاتا ہے جس سے بیوی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ پولٹیکل سائنس کی زبان میں اس حرکت کو واک آوٹ کہتے ہیں۔

واک آوٹ کی کئی قسمیں ہیں، اور ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کی دو قسمیں بڑی پوپلر ہیں۔ ایک وہ جس میں ناراض آدمی سر جھکا کر خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں وہی ناراض آدمی اپنی مٹھیاں کو بھینچ کر نعرے لگاتا ہے، چیختا ہے۔ اور پیروں کو زمین پر پٹک پٹک کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی چھوٹی سی دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

واک آوٹ جمہوری زندگی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ معلوم نہیں وہ دنیا کی کون سی پہلی شخصیت تھی جس نے واک آوٹ جیسے حربے کو دریافت کیا۔ اور انسان کو اپنی برہمی اور ناراضگی کے اظہار کا ایک آسان طریقہ بتایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طریقے کو عوامی سطح پر اتنا برتا گیا ہے کہ اب واک آوٹ ایک سستی قسم کی چیز ہو کر رہ گیا ہے، جس کو دیکھو وہ اپنے اپنے انداز میں واک آوٹ کر رہا ہے۔ کیا طالب علم، کیا اُستاد، کیا نرس، کیا ڈاکٹر، کیا کسان کیا مزدور اور کیا زمیندار، کیا کلرک اور کیا باس، غرض سب ہی اپنی بات دوسرے کو سنوانا چاہتے ہیں۔

اور دوسرا اپنی ۔ اس شور وغل اور ہنگامے میں کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ اور نہ پتہ چلتا ہے کہ کون واک آؤٹ کر رہا ہے ۔

واک آؤٹ ہمیشہ اپوزیشن پارٹی کی طرف سے ہوتا ہے ۔ خواہ اسمبلی میں ہو یا پارلیمنٹ میں یا گھر میں ۔ ان دونوں میں بنیادی فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کی ساری کارروائی اخبارات میں چھپتی ہے اور گھروں کی نہیں ۔ اگر گھروں کی تفصیلات بھی چھپنے لگیں تو عوام اسمبلی اور پارلیمنٹ کو بھول جائیں اور روزانہ اخبارات کی اشاعت دگنی تگنی ہو جائے ۔ گھروں میں اپوزیشن پارٹی کی لیڈر ہمیشہ عورت ہوتی ہے اور وہ بھی بیوی ۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی کوئی دوسری عورت برسر اقتدار آجائے ۔ ایسی صورت میں اپوزیشن اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے ۔ ورنہ بیوی خواہ وہ جاہل ہو یا دنیا کی بڑی انٹلکچوئل اپوزیشن کی کرسی پر اپنے بچوں اور بچیوں کے ساتھ بیٹھنا زیادہ پسند کرتی ہے ۔ اور مرد بے چارے کو ہر ناخوشگوار صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اِدھر پیاز کی قیمت بڑھی اُدھر شوہر کو بیوی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا ہے کہ وہ ہر مہینہ دیئے جانے والے مقررہ پیسوں میں اضافہ کیوں نہیں کرتا ۔ اس کے برعکس جہاں بیوی کمانے والی ہو اور شوہر گھر میں بچوں کو سنبھالتا ہو تو وہاں سرے سے اپوزیشن ہوتا ہی نہیں ۔ کیا مجال جو شوہر اپنی بیوی سے یہ دریافت کرے کہ رات میں وہ کس کی اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر آئی تھی ۔

ارے ہوگا کوئی ۔ بے روزگار شوہر آفس کے ان رموز کو کیا سمجھے !

اگر کوئی شوہر اس رمز کو سمجھنے پر اصرار کرے تو بیوی مستقلاً شوہر کی زندگی سے واک آؤٹ کر جاتی ہے ۔ اس عمل کو مذہبی زبان میں خلع اور سرکاری زبان میں طلاق کہتے ہیں ۔

اس کے برعکس اگر شوہر کو اپنی بیوی کا آفس کے کسی افسر کی اسکوٹر کے پیچھے بیٹھنا پسند نہ آئے تو اسے بھی یہ قانونی حق پہنچتا ہے کہ بیوی کو اپنی زندگی سے اور اپنے گھر سے نکال دے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسی وقت مہر کی رقم اپنی بیوی کو ادا کرے ۔ ورنہ شوہر اکثر بیوی

سے سمجھوتہ کرتا ہے۔ سمجھوتہ کیا، بیوی کے پاس کے سگریٹ لانے کے لئے وہ بیوی اور افسر دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بازار چلا جاتا ہے۔

عام طور پر گھریلو زندگی میں واک آوٹ کی دلچسپ قسم وہ ہوتی ہے جب شروع شروع میں کمرے سے کھسر پھسر کی آوازیں آتی ہیں اور پھر آہستہ سے دروازہ کھلتا ہے، اور بیوی باہر آکر دالان میں اپنی ساس یا نند یا اپنے بچوں کے بازو سو جاتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ شوہر محترم باہر آکر اپنے بھائی یا بچے کے ساتھ سو جائے۔

واک آوٹ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی، گھر سے ہو یا اقوام متحدہ کی کسی اسمبلی کے فلور سے وہ اُٹھتا ہوا تیز قدم ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن کسی گروہ، طبقے، قوم یا فرد کا بدترین واک آؤٹ وہ ہوتا ہے جب وہ خفا ہو کر دنیا ہی کو چھوڑ دے۔ ان حضرات کے یہاں ایک ٹکنیکل غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ واک آوٹ کی پوری تعریف سے واقف نہیں ہوتے۔ واک آوٹ کسی خاص مسئلے پر اپنی ناراضگی کا ایک جذباتی ردعمل ہے جو لمحاتی ہوتا ہے۔ جیسے ہی منظر بدلے اور دوسرا موضوع زیر بحث آئے وہ سب کے سب واپس آجاتے ہیں اور زندگی کی بھرپور دلچسپیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کس ملک کے انٹلکچوئل نے ان سے کہہ دیا کہ واک آوٹ کرنے والا جا کر لوٹتا نہیں۔

نیو اِیّر

نیا سال آدھی رات کو دبے پاؤں ایک چور کی طرح گھر میں داخل ہوتا ہے اور پچھلا سال بنا کچھ کہے ماضی کے سارے سرمائے کو سمیٹ کر غائب ہو جاتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون گیا اور کون آیا۔

لیکن نئے سال کی صبح صبح بڑے زور سے کال بل بجتی ہے یا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔ اور آواز سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ضرور مکان دار اپنا پانچ مہینوں کا بقایا وصول کرنے آیا ہے۔ یا پھر کوئی ساہوکار آخری الٹی میٹم دینے آیا ہے کہ اب بھی اگر واجب الادا قرضہ ادا نہ کیا جائے تو وہ عدالت میں ہم سے ملاقات کرے گا۔ ڈر اور خوف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دروازہ کھولنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی ساہوکار نہیں بلکہ ہمارا دوست ہے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اتنی صبح ــــ!

ہم حیرت سے اس کا منہ تکتے ہیں ــــ!

اور وہ اپنے میلے کچیلے کم از کم تیس دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہماری حیرانی پر اظہارِ افسوس کرتا ہے اور ہماری جہالت کا مذاق اُڑاتا ہوا ایک اہم اطلاع دیتا ہے کہ آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔

اوہو ــــ نیا سال ــــ پہلا دن ــــ پہلا دن ــــ!!

ہم آپ ہی آپ بڑبڑاتے ہیں۔ اور ایک طرح سے اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ جواباً ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ لہٰذا ہم ہنسنے لگتے ہیں!

ہی ہی ــــ ہا ہا ــــ سال کا پہلا دن ــــ!!

ہماری ہنسی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اور یہ اس شخص کی ہنسی سے بڑی مشابہ ہوتی ہے جس نے بھرے بازار میں اپنی کسی بے وقوفی کا مظاہرہ کیا ہو۔ اور اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے ہنسی کا سہارا لے رہا ہو۔ ورنہ یہاں ہنسی کا کون سا موقع ہے۔

اس عجیب و غریب صورتِ حال پر ہمارا دوست قہقہہ لگاتا ہے، کھنکارتا ہے اور پھر اپنی ٹائی کو درست کرکے بڑے سنجیدہ مگر خوشگوار انداز میں مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہتا ہے ــــ "وِش یُو ہیپی نیو ایئر ــــ!"

ساتھ ہی ہمارے دماغ کے سارے بند دریچے کُھل جاتے ہیں۔ اور فوراً ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ اب ہمیں کیا کہنا چاہئے۔ لہٰذا ہم بھی گلے کو صاف کرکے اور اپنے باسی چہرے پر مسکراہٹ کی مصنوعی چمک پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں ' وِش یو ہیپی نیو ایئر ':

سیم ٹو یُو ــــ!

سیم ٹو یو ــــ!!

بے تکلفی کی صورت میں گلے بھی ملنا پڑتا ہے۔

ہمارا یہی تجربہ ہے اور اب تک جتنے سال ہماری زندگی میں چپکے سے داخل ہوئے ہیں۔ ان کی اطلاع ہمیں باقاعدہ چند مخلص دوستوں کے توسط سے ملتی رہی ہے۔ اور ہم کبھی کبھی سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ اگر ایسے دوست ہمیں نصیب نہ ہوتے تو زندگی کتنی بے کیف ہوتی۔ اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ آس پاس کی بات کو جانے دیجئے۔ ہم کو اپنے بارے میں جتنا کچھ بھی علم ہے وہ محض دوستوں کی وجہ سے۔ مثلاً ہم بیمار پڑنے والے ہیں تو ہم سے پہلے ہمارے دوستوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ پرسوں اتوار کی شام کو ہم پر فلو کا حملہ ہونے والا ہے لہذا ہوشیار۔ ہوشیار یا پھر ہم پیر کی صبح سے بے حد صحت مند نظر آتے ہیں۔ ضرور دال میں کالا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یا پھر ہمیں ان ضرورتوں کا احساس دلوایا جاتا ہے جس کے لئے ہم نے کبھی بے چینی محسوس نہیں کی۔ مثال کے طور پر فوراً ہمیں ایک جوڑ ایمبیسڈر شوز خرید لینا چاہیئے۔ کیونکہ موجودہ شوز پنجے کو داب رہا ہے۔ اور انگوٹھے میں درد ہے یا ہمیں اس مکان کا تخلیہ کر کے کسی ایک ایسے گھر میں منتقل ہو جانا چاہیئے جو صاف روشن اور ہوا دار ہو۔ کیونکہ یہاں ہمیں ہر قسم کی تکلیف ہے اور اگر جرأتِ رندانہ ہو تو ہمیں اپنی ملازمت چھوڑ کر کوئی ایسا بزنس شروع کرنا چاہیئے جس میں لاکھوں کی آمدنی ہو۔ یا پھر اپنی بیوی کو طلاق دے کر کسی ایسی خاتون کا شوہر بن جانا چاہیئے جو ایک ہی رات میں ہمیں لکھ پتی بنا دے۔ صرف اس لئے کہ ہمارا پیشہ اور ہماری بیوی خود ہماری طبیعت اور مزاج سے مختلف ہے اور ہمارا مزاج کیا ہے یہ ہم نہیں جانتے، ہمارے دوست جانتے ہیں۔

بخدا ہم اپنے دوستوں کے بے حد ممنون ہیں۔ یہ ہمارا قدم قدم پر ساتھ دیتے ہیں، اور ان ہی کی بدولت ہر نئے سال کے پہلے دن اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ عمر عزیز کے کتنے سال سڑکوں، ہوٹلوں اور سینماؤں کی نذر ہو گئے۔

یہاں ہمیں دوستوں کی شکایت مقصود نہیں۔ صرف یہ عرض کرنا تھا کہ نئے سال کی خوشی

میں بچھڑے ہوئے اور ناراض دوست ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے تعلقات میں زیادہ کشیدگی ہے تو نئے سال کی آمد سے فائدہ اٹھا کر پھر دوستی کی تجدید ہو سکتی ہے۔ یہی نہیں کسی جانی پہچانی خاتون کے گھر جا کر مبارکباد دینے میں اس کا شوہر بھی آپکے اخلاق کا قائل ہو جائے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ اس زمانے میں جہاں ہر شخص کاروباری بنتا جارہا ہے آپ غنیمت ہیں۔ بڑے بڑے تاجر اس اخلاقی حربے سے گاہکوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ اخباروں میں تین تین چار چار کالموں کے اشتہار چھپوا کر جہاں وہ نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں، وہیں نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے اپنی فرم، کمپنی یا اپنی دکان کا نام نوٹ کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ بلکہ بار بار اشتہار چھپوا کر آپ کو اپنے بونس اور ٹریڈ مارک کا حافظ بنا دیتے ہیں تاکہ انھیں سال بھر آپ کی خدمت کا موقعہ حاصل رہے۔ اور آپ ایک نئے سال کے کیلنڈر کے عوض انھیں پورا سال یاد کرتے رہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عوام کی زندگی میں نیا سال صرف ایک دن کے لئے آتا ہے اور باقی تین سو چونسٹھ دن لالہ سیٹھ کروڑی مل کی دکان اور گھر میں رہتا ہے۔

انگریزوں کے راج میں بھی نیا سال آتا تھا۔ آتا کیا، انگریز باقاعدہ اسے لاتے تھے اور ٹھیک رات کے بارہ بجے وائٹ ہارس کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کا استقبال کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی عزیز رعایا کو بھی اپنی خوشیوں میں اس طرح شریک کر لیتے تھے کہ ایک دن پہلے ملازمین سرکار کو تنخواہ بانٹ دی جاتی تھی۔ لہذا دونوں اپنے اپنے انداز میں جشن مناتے تھے۔ آج بھی انگریزوں کی اس روایت کو اسی انداز میں اپنایا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عوام کی بھلائی کی خاطر سرکاری ملازمین کو پیشگی تنخواہیں ایصال نہیں کی جاتیں۔ ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ نئے سال کی خوشی میں مہینے بھر کا بجٹ ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیں۔ اس لئے سرکاری ملازمین اور کارخانوں میں کام کرنے والے لاکھوں مزدور بغیر تنخواہ کے خالی خولی ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے پھرتے ہیں۔ چھٹی کا دن جو ٹھہرا۔

سچ پوچھیئے تو نئے سال کے پہلے دن چھٹی اس لئے دی جاتی ہے کہ عوام اپنے تعلقات استوار کریں۔ اور قومی یکجہتی کے مفید فارمولے کو اپنی عملی زندگی میں برتیں۔ ہندو، مسلمان سے ملتے ہیں۔ مسلمان ہندوؤں سے ملتے ہیں۔ اور پھر یہ ہندو مسلمان دونوں اس ملک میں رہنے والی دوسری اقلیتوں سے مل کر کہتے ہیں' نیا سال مبارک ۔۔!

ہمارا ہر چھوٹا بڑا لیڈر اس خوشگوار صورتِ حال اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے منظر کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور فوراً ٹام ٹام ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس طلب کر کے کہتا ہے کہ پچھلے سال کو بھول جاؤ۔ کیونکہ پچھلا سال مصیبتوں اور پریشانیوں کا سال تھا لیکن نیا سال نئی توقعات اور نئی اسکیموں کے ساتھ آیا ہے۔ اس لئے عوام کو پُر امید ہونا چاہیئے، اور مسکراتے ہوئے بڑے صبر کے ساتھ نئے سال اور نئے سال کے چیلنج کو قبول کرنا چاہیئے۔

نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر عوام کے رہنما اپنے ملک اور بیرونِ ملک کے عوام کے نام خوشحالی اور نیک تمناؤں کے پیامات بھیجتے ہیں۔ یہ پیامات ان کے اپنے اوریجنل نہیں ہوتے بلکہ ان کے اپنے سکریٹری صاحبان کے ڈرافٹ شدہ ہوتے ہیں جو خاص اسی مقصد کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ البتہ دستخط ان کی اپنی اوریجنل ہوتی ہے۔ ویسے یہ پیامات بڑے اہم ہوتے ہیں۔ ان میں پانچ سالہ منصوبوں کا ذکر ہوتا ہے اور ان اسکیموں کا بھی جو فی الحال نیتا لوگوں کے دماغوں میں ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ صرف نیتا حضرات ہی پیامات بھیجیں۔ ہر بالغ مرد اور عورت کو یہ آزادی حاصل ہے کہ نئے سال کے پہلے دن وہ کسی کو بھی مخاطب کرے۔ گریٹنگ کارڈ اس کی ایک خوبصورت شکل ہے۔ عام طور پر اسے ایک خوبصورت کاغذ پر چھپوایا جاتا ہے۔ لیکن اگر جیب اس کی اجازت نہ دے تو سائیکلو اسٹائیل کروالیا جاسکتا ہے۔ ورنہ سمجھ دار آدمی ہاتھ سے ہی لکھ کر اس ضرورت کو پورا کرلیتے ہیں۔ گریٹنگ کارڈ میں صرف ان مشہور مفکرین یا ادیبوں کے اقوالِ زریں ہوتے ہیں جن کا تعلق بیرون ممالک سے ہے۔ دیسی ادیبوں کے کسی قول کو بغیر حوالے کے نقل کرنا ممنوع ہے،

اگر کسی نے ایسی غلطی کی تو اسے جاہل اور قدامت پرست سمجھا جائے گا۔ ہمیشہ مغربی ادیبوں اور شاعروں کے کسی نہ کسی قول کو پیش کرنا چاہئے۔ لیکن قول ایسا ہونا چاہئے جو خود بھیجنے والے کی سمجھ میں نہ آسکے۔ اس سے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ گریٹنگ کارڈ وصول کرنے والوں پر بھیجنے والے کا رعب پڑ جائے گا۔ دوسرا یہ کہ بھیجنے والے کو جواباً قسم قسم کے گریٹنگ کارڈس ملیں گے جن کی نمائش کا وہ کسی مناسب موقع پر اہتمام کرسکتا ہے۔

گریٹنگ کارڈ بھیجنا ایک کلچرڈ سوسائٹی کی علامت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بھیجنے والا کتنا کلچرڈ ہے یا نہیں۔ گریٹنگ کارڈ صرف ان حضرات کو بھیجنے چاہئیں جن سے کبھی دُور کا تعلق رہا ہے یا پھر جن کی حیثیت محض ایک اجنبی کی سی ہے۔ اپنے دوست، احباب اور رشتہ داروں کو کبھی بھول کر بھی نہیں بھیجنا چاہئے کیونکہ اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں، دوسروں کو اور غیروں کو اپنانا کمال ہے۔ البتہ ان لوگوں کو گریٹنگ کارڈ ضرور بھیجئے جو آپ کو قطعاً نہیں جانتے۔ تاکہ وہ آپ کے نام کو یاد رکھ سکیں۔ کسی ملک کی ادبی یا سیاسی شخصیت کو گریٹنگ کارڈ بھیجنا مستحسن ہے۔ اگر اس شخصیت کے پرسنل سکریٹری کی طرف سے آپ کو جواب مل جائے تو کیا کہنے۔ آپ اس تعلق سے اخبارات میں نیوز جاری کر واکر اپنے احباب اور عوام کو متاثر کرسکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ فلاں ملک یا ریاست کے صدر یا وزیرِ اعلیٰ سے آپ کے تعلقات بے حد خوشگوار ہیں۔

نئے سال کے پہلے دن کیا کیا نہیں ہوتا۔ ماتحت اپنے عہدہ داروں کو سلام کرنے جاتے ہیں۔ بیوی اپنے شوہر سے ساڑی مانگتی ہے، بچے ٹافی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ محبوبائیں اپنے اپنے عاشقوں سے کسی بڑھیا تحفے کے لئے اصرار کرتی ہیں۔ فلم انڈسٹری کے مشہور ایکٹر اور ایکٹریس اپنی نئی فلم دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل اپنا اسپیشل نمبر

نکالتے ہیں۔ ملک کے تمام پارکوں اور تفریحی مقامات پہ رات کے بارہ بجے تک گھما گھمی رہتی ہے، جیلوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ سیاسی اور غیر سیاسی قیدی اپنی مقررہ میعاد سے پہلے سڑکوں اور گلی کوچوں میں آزادانہ گھومتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ پرسوں ہی ہم نے ایک عادی مجرم کو دیکھا جس نے جیل جانے سے پہلے ہمارے جھونپڑے پر اُچٹتی نظر ڈالی تھی اور جسے ہمارا ریڈیو پسند آگیا تھا۔ اس مجرم کو عدالت نے کئی سائیکلوں، ٹرانسسٹر، اور دوسرے قیمتی سامان چرانے کے جرم میں دو سال قید با مشقت کی سزا دی تھی۔

لیکن اب ــ!

ہم نے اسے حیرت سے منہ کھول کر دیکھا۔

اور جب ہم نے اس کی اس غیر متوقع رہائی کا سبب پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا، واہ صاحب یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سمجھ جائیے، نئے سال کی معافی۔ پھر اس نے اپنا لہجہ بدل کر کہا، صاحب! نیا سال مبارک ــ!

اور ہم نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ہمارے کسی نئے ریڈیو کے بارے میں استفسار کر رہا ہے ــ!

نجومی اور فقیر نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک پیش گوئی کرتا ہے، دوسرا دعائیں دیتا ہے۔ کسی نئے سال کے موقع پر ایک موڈرن پامسٹ نے ہمارا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ ہم پانچ سال کے اندر اندر ڈھائی لاکھ کے مالک بن جائیں گے۔ کیسے اور کیونکر۔ یہ تفصیل اس نے نہیں بتائی۔ لیکن مشہور پامسٹ کیرو کے حوالے سے اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا۔ اور کیرو ہماری دُکھتی رگ تھا۔ لہٰذا ہم نے یقین کر لیا۔ اور لکھ پتی بننے کے لئے ہم نے ریس کے گھوڑے ہی نہیں دوڑائے بلکہ خود گھوڑوں کے پیچھے بھاگتے رہے اور ہر اس لاٹری کا ٹکٹ خریدا جو بازار میں نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ سال کیا دس سال

گزر گئے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اور پھر ایک ایسے ہی نئے سال کی سہانی صبح ایک اور موڈرن پامسٹ نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ منسٹر بننا ہماری تقدیر ہے۔ لہذا ہمیں فوراً الکشن لڑنا چاہئے۔ صرف اس لئے کہ ہمارے ہاتھ کی ریکھائیں یہی کہتی ہیں۔ کیا جانے اس باوبہ پیشگوئی صحیح ثابت ہو۔ اس لئے آج کل ہم سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیں۔ اور الکشن لڑیں۔

فقیر بھی معمولی خیرات کے عوض کسی کو ایک بڑی دعا دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ کبھی تو وہ کسی کو کسی ریاست کے تخت پر بٹھا دیتا ہے اور کبھی اس کے جی میں آجائے تو ایک بڑا ملک ہی دے دے۔

اللہ کے نام پر دیتا جا ــــ!

کسی فقیر کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ اور بغیر کسی لالچ کے ہم نے چلتے چلتے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی ابھری ہوئی ہتھیلی پر دس پیسے رکھ دیئے۔

لیکن فقیر نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی۔ وہ بڑے انداز سے کہنے لگا۔ واہ مائی باپ واہ۔ یاد نہیں آج سال کا پہلا دن ہے۔ اگر آج اتنی خیرات لے لوں تو سال بھر یہی خیرات ملتی رہے گی۔ مائی باپ کو خدا سلامت رکھے۔ آج تو میں آپ سے لڑ کر پلاؤ کھاؤں گا ــ پلاؤ ــ کھی کھی ــ فقیر بغلیں بجا بجا کر ناچنے لگا۔

اور ہم اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آگے بڑھ گئے۔

اور نیا سال پیچھے پیچھے ماضی کی ویران وادیوں کی طرف ایک گیند کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔

ہم نے پرچے جانچے

ہمارا اگزامنر بننا دوسروں کے لئے اہم ہو یا نہ ہو لیکن طلبار کے لئے خاصی اہم بات تھی. حالانکہ اس راز کا انکشاف ہم نے کسی پر نہیں کیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں طلبار کو کیسے پتہ چل گیا اسی وقت سے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی آگئی۔ جب ہم نے تاج محل یونیورسٹی کا دعوت نامہ بحیثیت اگزامنر قبول کیا۔ ساتھ ہی ہم نے محسوس کیا جیسے ہم بڑے آدمی بن گئے ہیں۔

ویسے طلبار پہلے بھی سلام کرتے تھے۔ لیکن اب ان کے سلام کے ایک معنے تھے۔ ملاقات کا ایک مقصد تھا۔ مزاج پرسی اپنے اندر سینکڑوں مفہوم رکھتی تھی۔ ان میں سے کوئی سلام کر کے پیچھے پیچھے آتا، کوئی ہمارے لکچر کی تعریف کرتا۔ اور کوئی پابندی کے ساتھ کلاس روم میں آتا ہوا نظر آتا۔ خصوصیت کے ساتھ ایسا طالب علم بھی جس نے سال بھر کلاس روم میں قدم رکھنے کی کبھی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ کالج کی چار دیواری کے باہر بھی ہم نے ایک خوشگوار اور صحت مند قسم کی تبدیلی محسوس کی۔

طلباء کے والدین جس میں مائیں کم اور باپ زیادہ تھے ۔ ہمیں دیکھتے ہی خلوص اور اخلاق سے اپنی آنکھیں بچھا دیتے ۔ اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں یوں کہتے ۔ ہمارے نورِ نظر لختِ جگر کا خیال رکھئے ۔

اگزامنر شپ کے ان کرشموں سے ہمارا دماغ خراب ہوا اور نہ ہم میں اکڑ مکڑ پیدا ہوئی ۔ ہمارے قدم زمین پر ہی ٹکے رہے، صرف اس لئے کہ ہماری زندگی کا مقصد کبھی اگزامنر بننا تھا اور نہ ہم نے کبھی اس کے خواب دیکھے تھے ۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اگزامنر بننے کی ہمیں جو خوشی ہوئی وہ خوشی شاید صدر جمہوریہ ہند بننے سے بھی نہ ہوتی ۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ اب ہمیں اگزامنر شپ سے بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آیا تھا ۔ اور اس انتقام کا تعلق ہماری اس قسم سے ہے جب ہم نے زمانہ طالب علمی میں کھائی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت طالب علم ہمارے تعلقات اگزامنر سے کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے ۔ ہم سوچتے تھے کہ یہ حضرات جو خود بھی کبھی طالب علم رہے ہوں گے آخر اگزامنر بنتے ہی اتنا کیوں بدل جاتے ہیں ؟ اور وہ طلباء کے ساتھ قصابوں جیسا سلوک کیوں کرتے ہیں ۔ کیا ان کے دل کے کسی گوشہ میں ہمدردی اور محبت کا ہلکا سا جذبہ لہریں نہیں لیتا ــــ ؟

ہمارا خیال تھا کہ اگزامنر کے یہاں انصاف نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہوتی اور وہ سرے سے طالب علم کا دشمن ہوتا ہے ۔ یہ رائے ہم نے یوں ہی قائم نہیں کی تھی بلکہ اس کے پیچھے ہماری طالب علمانہ زندگی کا تلخ تجربہ اور مشاہدہ تھا ۔

غور فرمائیے سال بھر کی سخت محنت کے بعد طالب علم امتحان دیتے ہیں ۔ اور اللہ اللہ کر کے جب نتیجے کا مبارک دن آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کہیں کے نہ رہے ۔ یا پھر جنھیں

درجہ اول میں کامیاب ہونا چاہیے تھا وہ درجہ دوم میں پاس ہوتے ہیں اور جنھیں درجہ سوم میں پاس ہونا چاہیے تھا وہ امتیاز کے ساتھ درجہ اول میں پاس ہوتے ہیں۔ اسے اگزامنر کی جانبداری کہیئے یا کچھ اور لیکن ہے یہ ایک حقیقت۔ ہم نے خود ایسے کئی طالب علموں کو امتیاز کے ساتھ امتحانات پاس کرتے دیکھا ہے جو ٹھیک سے بات بھی نہیں کرسکتے اور جو نہ دو سطریں ڈھنگ سے لکھ سکتے ہیں۔ شرما شرمی میں کچھ کہہ لیا تو کہہ لیا ورنہ بات بات پر منہ سے رال بہنے لگتی ہے۔ بھلا ان کے بارے میں کوئی کیا رائے قائم کرسکتا ہے۔ اور وہ طالب علم جن سے خاندان کو نہیں اساتذہ کو بھی بڑی توقعات تھیں نتیجے کے کالم میں دوسرے تیسرے درجے میں دبکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دور کیوں جائیے ہم خود اس خصوص میں اپنی زندہ مثال پیش کریں۔ یقین ہے کہ آپ ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہوں گے۔ اگر نہیں تو ہم اپنے ان محترم اساتذہ اور پروفیسروں کے نام گنائیں جنھوں نے ہمیں بہترین طالب علم ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے۔ اور جن کا خیال تھا کہ ہم اپنے ماں باپ اور خاندان کا صرف نام روشن نہیں کریں گے بلکہ ان کے نام کو بھی چمکائیں گے۔ لیکن صد افسوس انھیں ہمارے نتیجے سے سخت مایوسی ہوئی۔

پہلی بار میٹرک میں فیل ہوئے اور دوسری بار دن رات کی لگاتار محنت کے بعد امتحان دیا۔ اور الحمدللہ فرسٹ کلاس جوابات لکھے اور اللہ کو حاضر و ناظر جان کر نتیجے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟

کیا عرض کریں۔ شرم آتی ہے۔ نہ فرسٹ ان فرسٹ آئے اور نہ فرسٹ کلاس۔ صرف درجہ سوم میں بڑی مشکل سے پاس ہوئے۔ اور ہمارے ایک بزرگ بہی خواہ کے بیان کے مطابق ضرور اگزامنر نے ہمیں نیچا دکھانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ورنہ کیا مجال رشید جیسا کھیل کود کار سیا طالب علم ہم سے اونچا مقام حاصل کرلیتا۔ لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اور اپنی اس ناکامی کی خفت مٹانے کے لئے انٹرمیڈیٹ میں جان توڑ محنت کی اور امتحان سے پہلے

صدق دل کے ساتھ چالیس روز کا تعلیمی چلہ بیٹھا۔ یعنی دن رات پڑھتے رہے۔ یوں سمجھئے کہ کتابیں اوڑھنا بچھونا تھیں۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارا نام محنت اور صداقت کی ایک علامت بن گیا۔ اور دُور دُور تک لوگ اپنی نالائق اولاد کو ہماری مثال پیش کر کے کہتے رہے دیکھو پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔

نتیجے کا کچھ نہ پوچھئے۔ یہاں بھی ہمارا وہی حشر ہوا جو میٹرک میں ہوا تھا۔ بہ مشکل سکنڈ کلاس آئے۔ چنانچہ بی اے اور ایم اے تک یہ نحوست ہمارے ساتھ چمٹی رہی۔ آخر کار اِس نحوست سے بچنے کے لئے ہم نے خود کو مستقلاً چھٹی دے دی۔ دوسرے الفاظ میں ہم نے اس شخص کو جسے اگزامنر کہتے ہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا جو باقاعدہ میٹرک سے ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ ویسے بعض قریبی احباب کا مخلصانہ مشورہ تھا کہ ہم کسی غیر معروف مرحوم شاعر یا ادیب کی قبر کا کتبہ پڑھ کر ریسرچ کر ڈالیں اور بیٹھے بٹھائے ڈاکٹر بن جائیں۔

وہ دن یقیناً ہماری زندگی کا سنہرا دن تھا جب ہم نے تاج محل یونیورسٹی کا دعوت نامہ خوشی خوشی قبول کیا اور اپنے تئیں عہد کیا کہ ہم دانستہ یا نادانستہ کسی طالب علم کو نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ شروع سے آخر تک لبرل رہیں گے۔ اور ان تمام امیدواروں کو پاس کریں گے جن کے جوابی پرچے ہمارے حصے میں آئیں۔

پوسٹ مین سے جوابی پرچوں کے انشورڈ پارسل وصول کرنے کے بعد ہم نے انھیں کھولا۔ اور ترتیب سے میز پر رکھ دیا۔ شاید پرچے جانچنے کی پہلی منزل یہی تھی۔ یہ پرچے ملک میں منعقد ہونے والے امتحانات کے مختلف سنٹروں سے آئے تھے۔ کچھ تو ہماری اپنی یونیورسٹی کے تھے اور کچھ کوہ نور یونیورسٹی کے۔

اللہ کا نام لے کر ہم پرچے جانچنے بیٹھ گئے۔ پہلا پرچہ جو ہم نے ڈھیر سے اُٹھایا وہ نیو موڈرن آرٹس اینڈ سائنس کالج سنٹر سے بیٹھنے والے بی اے کے طالب علم کا تھا۔ از روئے قاعدہ

پانچ سوال حل کرنا ضروری تھے۔ لیکن زیر بحث طالب علم نے صرف تین سوال حل کئے تھے پہلا سوال متن کے حوالے سے تشریح کا تھا۔ اور جیسے متعلقہ طالب علم نے جیسے تیسے کیا تھا۔ لیکن دوسرا اور تیسرا سوال ـــــ!

ہم چکرا گئے۔ طالب علم نے کچھ عجیب و غریب جوابات لکھے تھے۔ پہلے پہل تو ہم نے ہر بات اس کی غیر معمولی ذہانت پر محمول کی۔ لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے خود ہمیں اپنی معلومات پر شبہ ہونے لگا۔ طالب علم نے بڑے وثوق کے ساتھ میر تقی میر کی شاعری پر اپنے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں انکشاف کیا تھا کہ غالب کے بے شمار شاگردوں میں اگر کسی نے نام پیدا کیا ہے تو وہ میر ہے۔ غالب جیسا کٹر قسم کا فن کار بھی اپنے شاگرد میر تقی میر کی فن کارانہ صلاحیتوں کا ڈنکے کی چوٹ اعتراف کرتا ہے۔ غالب نے خود کہا ہے کہ وہ جو میر کا معتقد نہیں وہ میرا معتقد نہیں۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا۔ اُستاد اور شاگرد کے تعلقات کیسے دوستانہ تھے۔ سچ پوچھئے تو غالب اُستاد تھے اور نہ میر شاگرد۔ ان دونوں میں چچا بھتیجے کا رشتہ تھا۔ غالب اپنے بھتیجے میر کو بڑا عزیز رکھتے تھے اور بھتیجا اپنے چچا کی محبت کو ہمیشہ آزماتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو میر کی موت کا بے حد دُکھ ہوا۔ حالانکہ غالب کو میر کی بے جا فرمائشوں کی وجہ سے زیر بار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن یہ تو خونی رشتہ تھا۔ اس لئے غالب نے اپنے بھتیجے کی موت پر ایک پُر اثر مرثیہ لکھا۔ غالب کا یہ مرثیہ اُردو ادب میں ایک کلاسک کی حیثیت رکھتا ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ غالب کے نام کو باقی رکھنے کے لئے یہی ایک مرثیہ کافی ہے۔

تیسرا سوال مولانا حالی کی مشہور نظم مسدس کے بارے میں تھا جو اسلام کے عروج و زوال کی ایک کہانی ہے۔ طالب علم کو ہدایت دی گئی تھی کہ اس کی اہمیت کو تاریخی پس منظر میں واضح طور پر پیش کرے۔

اُمیدوار کا جواب سننے سے زیادہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں۔ لیکن جواب کچھ اس قسم کا تھا۔ ملاحظہ ہو:

"مسدس حالی" اپنے وقت کی ایک اہم اور مشہور کتاب ہے جسے مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی۔ اس پر ایک نوٹ کیا ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن وقت اتنا کم ہے کہ ساری اہم باتیں تفصیل سے نہیں لکھی جاسکتیں۔ اور خود جناب والا کو اس کا اندازہ ہوگا، پھر بھی مختصراً چند باتیں عالی جناب کی خدمت میں پیش ہیں:-

(۱) حالی نے مسدس حالی میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ سرسید احمد خاں کے کارنامے پیش کئے ہیں۔

(۲) مسدس حالی کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک تاریخ ہے جسے حالی نے حوالوں کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

(۳) مسدس حالی میں خود حالی نے پوری ایمان داری سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ سرسید سے بے حد متاثر ہیں۔ چنانچہ سرسید ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے حالی کو ایک نیک اور سچا راستہ دکھایا۔ ورنہ حالی بھی دوسرے شاعروں کی طرح معشوقوں کی تعریف میں غزلیں کہتے تھے اور دن رات شراب کے نشے میں مست رہتے تھے۔ سرسید سے ملاقات کے بعد نہ صرف انھوں نے شراب چھوڑ دی بلکہ ان کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آگیا۔ اور وہ یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ وقت کے نمازی ہو گئے۔ سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ سب کو ایسی توفیق دے۔

(۴) سچ پوچھئے تو حالی نے مسدس لکھ کر حق دوستی ادا کیا۔ ورنہ بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے سرسید کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی، یہ بات غلط ہے ورنہ سرسید جیسے بزرگ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اپنی تعریف میں کتاب لکھواتے۔ کیا ان کے اپنے قدردان اور چاہنے والے کم تھے؟ اگر وہ چاہتے تو ایک نہیں، درجنوں کتابیں لکھوالیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

(۵) مسدس حالی کے چھپتے ہی مسلم قوم میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی اور عوام دھڑا دھڑ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے لئے چندے دینے لگے ۔ کیونکہ مسدس کے آخری حصہ میں حالی نے قوم سے چندے کی اپیل کی تھی ۔ اور اس کا اثر اتنا ہوا کہ طوائفوں نے بھی چندہ دیا ۔ یقیناً اللہ کو ان کی یہ ادا پسند آئی ہوگی ۔ بخشش کے لئے یہ کافی ہے ۔

(٦) مسدس ایک ایسی اہم کتاب ہے جسے ہندوستان کے مسلمان ٧٠ سال تک کلام پاک کے ساتھ رکھ کر پڑھتے رہے اور سرسید مرحوم کے نام پر فاتحہ پڑھ کر بخشتے رہے اور سرسید سے معذرت کرتے رہے کہ انھوں نے زندگی میں ان کی قدر نہیں کی، اور انھیں کافر کہا ۔

اب مسدس کے بارے میں اور کیا عرض کیا جائے ۔ سب سے اچھی تنقید خود سرسید کی ہے ۔ سرسید نے کہا تھا کہ جب میں ساتویں آسمان پر جاؤں گا اور خدا مجھ سے پوچھے گا کہ سرسید بتا ! تو نے دنیا میں کیا کام کیا تو جواب میں مسدس پیش کر دوں گا ۔ اور مجھے یقین ہے کہ خدا مسدس پڑھنے کے بعد مجھے بخش دے گا ۔

سبحان اللہ کیا تنقید فرمائی ہے سرسید نے ۔ سمجھنے والے کے لئے بہت کچھ ہے اور جو نہ سمجھے اس کے لئے خاک ۔ اصل میں سرسید نے اس تنقید میں ہلکا سا مگر چبھتا ہوا طنز کیا ہے ان فرشتوں پر جو آدمی کا اعمالنامہ لکھتے ہوئے ڈنڈی مارتے ہیں ۔ لیکن حالی نے مسدس میں سرسید کی زندگی اور ان کی شخصیت کی ایک ایک بات لکھ دی ۔ اس لئے سرسید مسدس کو اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔

مسدس کے تعلق سے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ یوں بھی جناب والا کو سمجھانے کی کوشش سورج کو چراغ دکھانا ہے ۔ مختصر یہ کہ مسدس اُردو ادب کی لافانی کتاب ہے ، دنیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ۔ یہی اس کی مقبولیت کی دلیل ہے ۔

جیسے ہی طالب علم کا جوابی پرچہ ختم ہوا ہم نے اناسین کی ایک نہیں دو دو گولیاں کھائیں پیشانی پر زندہ طلسمات رگڑا، اور بہت ہی اونچی آواز میں بیوی کو پکارا۔ بیوی حیران و پریشان دوڑی دوڑی کمرے میں آئی۔ اور نظروں ہی نظروں میں ہماری خیریت پوچھنے لگی۔ شاید ہماری بیوی کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا جس نے ہمیں اتنا پریشان دیکھا۔ ہم نے کہا، ہوا اوا کچھ نہیں، فوراً ایک گرم گرم چائے کی پیالی لاؤ۔

چائے پینے کے بعد ہم نے سگریٹ جلائی۔ اور ایک لمبے کش کے بعد ہم نے خود کو پرچے جانچنے کے لئے آمادہ کیا۔ جانے کتنی لمبی رات تک ہم پرچے جانچتے رہے۔ البتہ گھر والوں کا خیال ہے کہ صبح صبح تک ہمارے کمرے میں بلب جلتا رہا۔

ان جوابی بیاضوں میں کیا تھا اور کیا نہیں یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ اور ہر پرچے کے تعلق سے کچھ کہنا اور بھی مشکل بات ہے۔ اس لئے چند مختلف قسم کے نمونے بلا تنقید اور تبصرہ پیش کئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

پہلے اقتباس پڑھئے:

"بھائی تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں شہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو۔"

بی یو سی کے ایک طالب علم نے اس کی تشریح یوں کی تھی:

"یہ جملہ مرزا غالب کے خطوط سے لیا گیا ہے جس کو مولانا الطاف حسین حالی نے لکھا ہے۔ مجروح سلطانپوری کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ بھئی مجروح! تم تو اب اردو زبان اور شاعری کے قاتل معلوم ہوتے ہو۔ میں تو ابھی ابھی بازار سے آ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بازار میں اردو کی نہریں چل رہی ہیں اور تمام راستے رود نیل بن کر رہ گئے ہیں۔ اور تم اردو کو قتل کرتے پھر رہے ہو۔"

بی اے کے ایک طالب علم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں حسب ذیل انکشاف کیا ہے۔

"خاطر غبار" میں مولانا آزاد کے خود نوشت حالات ہیں۔ آزاد نے اپنی اسی کتاب میں ہر وہ بات لکھ دی ہے جو سیاسی اور ادبی حیثیت سے اہم ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ سوانح نگاری میں اس کتاب کا نمایاں مقام ہے۔

یلدرم کے بارے میں بی ایس سی کے ایک اردو طالب علم نے جو خیال ظاہر کیا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

سجاد حیدر یلدرم بنارس کے رہنے والے تھے اردو میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ یلدرم ایک شریف گھرانے کے چشم و چراغ تھے، میٹرک سے آگے نہیں بڑھے ریاضی ان کی کمزوری تھی اور کئی سال تک اس منحوس مضمون کی وجہ سے فیل ہوتے رہے۔ لیکن آخر میں انھوں نے اس امتحانی چکر سے نکل کر اپنا نام پیدا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریزی کے بڑے ادیب بن گئے۔ اور مغربی ممالک کا سفر کیا۔ تحریک آزادی میں اہم حصہ لیا۔ اور ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے کئی مرتبہ جیل گئے۔ لیکن ساتھ ساتھ اُردو ادب پر بھی انھوں نے بڑا احسان کیا، اور کئی انگریزی ناولوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ اللہ یلدرم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔"

رشید احمد صدیقی کے ایک قلمی خاکے کندن (علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک چپراسی) کے بارے میں پی یو سی کے ایک طالب علم نے اس طرح اظہار خیال کیا تھا:۔

"۱۹۴۷ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پر غنڈوں کا حملہ ہوا تو کندن وہ واحد شخص تھا جس نے ہاسٹل میں رہنے والے مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کی جان بچائی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فرائضِ سرکاری بھی انجام دیتا رہا۔ یعنی گھنٹہ بجا بجا کر طالب علموں اور اُستادوں کو گزرتے ہوئے وقت کی خبر دیتا رہا۔ مطلب یہ کہ وہ اڈیوٹی کھٹا کھٹ انجام دیتا تھا۔ وائس چانسلر نے خوش

...ا ہوکر اسے ترقی دی۔ رشید احمد صدیقی صاحب سے اس کے قریبی تعلقات تھے۔"

یہ تو ہوا نثر کا حال، اب اشعار کی تشریح بھی دیکھ لیجیے:۔

بطور نمونہ ایک شعر اور اس کی تشریح خدمت میں پیش ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کر علاج جوشش وحشت چارہ گر

لادے اک جنگل مجھے بازار سے

بی اے کے ایک طالب علم نے اس شعر کی وضاحت قریب قریب ان الفاظ میں کی ہے:

"شاعر کہتا ہے کہ اے دوست اگر تو میرا علاج کرانا چاہتا ہے تو بازار سے مجھے ایک جنگل لادے کیونکہ میرا علاج تو اب شہر میں ممکن نہیں، ڈاکٹروں کی ساری دوائیاں بے کار ثابت ہوئیں۔ اس لئے اب میں جنگل جاکر علاج کروانا چاہتا ہوں۔ سُنا ہے کہ جنگل کی جڑی بوٹیوں میں بے حد اثر ہوتا ہے۔"

اس کے علاوہ چند خاص خاص پرچوں میں کچھ اس قسم کی ضروری باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ باتیں پرچے کے ختم پر اور صفحے کے نچلے حصے میں بڑی احتیاط اور خفی خط میں لکھی گئی تھیں۔ ملاحظہ کیجئے:۔

نوٹ:۔ (۱) "طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے کچھ لکھ نہ سکی۔ معاف کرنا غلطی ہوئی۔ اللہ کے واسطے پاس کر دیجیے، مہربانی ہوگی۔"

(۲) "حیدرآباد اور بمبئی سے کتابیں منگوائیں لیکن کہیں سے نہ ملیں جتنا لیکچر سُنا تھا اتنا لکھ دیا۔ اس لئے خیال رکھئے۔"

(۳) "حالات بڑے خراب ہیں۔ اگر اس بار فیل ہوا تو زہر کھالوں گا۔"

(۴) "میرے والد وظیفہ یاب ہیں، اس لئے کسی بھی طرح پاس کر دیجیے مجھ پر نہیں بلکہ میرے خاندان پر احسان ہوگا ـــ اور سُنئے ـــ! براہ کرم پڑھنے کے بعد اسے کاٹ دیجیے۔"

ایسے ہم نے پرچے جانچے۔ اچھے برے۔ انتہائی ناقص خط کے، صرف ٹیڑھی میڑھی لکیریں والے جیسے چیونٹیوں کی رینگتی ہوئی ایک فوج۔ دائیں سے بائیں طرف، اور کبھی بجائے چیونٹیوں کے ہمیں کاغذ پر مکوڑے ہی مکوڑے نظر آئے۔ جوابی بیاضوں کا حجم اتنا کہ کچھ مت پوچھئے۔ پہلی نظر میں اگزامنر پر رعب پڑ جائے۔ غرض قسم قسم کے پرچے۔ لیکن ہر پرچہ اپنی ایک انفرادیت رکھتا تھا۔ اور اپنے لکھنے والے کے ذہن کی تصویر تھا۔ اور یہ بتاتا تھا کہ اُمیدوار کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی بیاض کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم تو کسی پر یا علی اور کسی پر ہری اوم۔ اور جہاں ان میں سے کچھ بھی نہ تھا وہاں اگزامنر سے براہ راست مخاطبت تھی۔

بہرحال ہم نے جیسے تیسے پرچے جانچے۔ مگر کیسے جانچے اور کیونکر جانچے۔ یہ نہ پوچھئے اور نہ ہمیں یاد ہے۔ اتنا بھی نہیں کہ ہماری وجہ سے کتنے طالب علم فیل ہوئے اور کتنے پاس۔ اگر یاد ہے تو صرف اتنا کہ یونیورسٹی کو دی ہوئی تاریخ کے اندر اندر پرچے بھیجنے کے بعد ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد دوسرے دن ہم نے تاج محل یونیورسٹی کے کنٹرولر آف اگزامنیشن کی خدمت میں ایک خط بذریعہ رجسٹری پوسٹ روانہ کیا۔

اب جب ہم نے خط کا ذکر بھی کر ڈالا تو اس کا مضمون بھی سُن لیجئے۔ ویسے یہ انتہائی راز کا خط ہے۔ لیکن اب آپ سے کیا چھپائیں۔ اور آپ سے راز باقی ہی کیا رہا، اس خط میں ہم نے کنٹرولر صاحب سے یہی درخواست کی کہ:

> وہ آئندہ سال ہمیں اس اعزاز سے نہ نوازیں۔ کیونکہ ماہ مارچ اپریل اور مئی میں ہم بڑے پریشان رہتے ہیں۔ اور ہمارے فیملی ڈاکٹر کا خیال ہے کہ تبدیلی آب وہوا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ ورنہ ہماری دماغی صحت

کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اس لئے آئندہ سال چھٹیوں میں ہم کسی ٹھنڈے مقام پر منتقل ہو رہے ہیں۔

اُمید کہ جناب والا ہماری معذوری کا خیال رکھتے ہوئے ہمیں معاف فرمائیں گے:
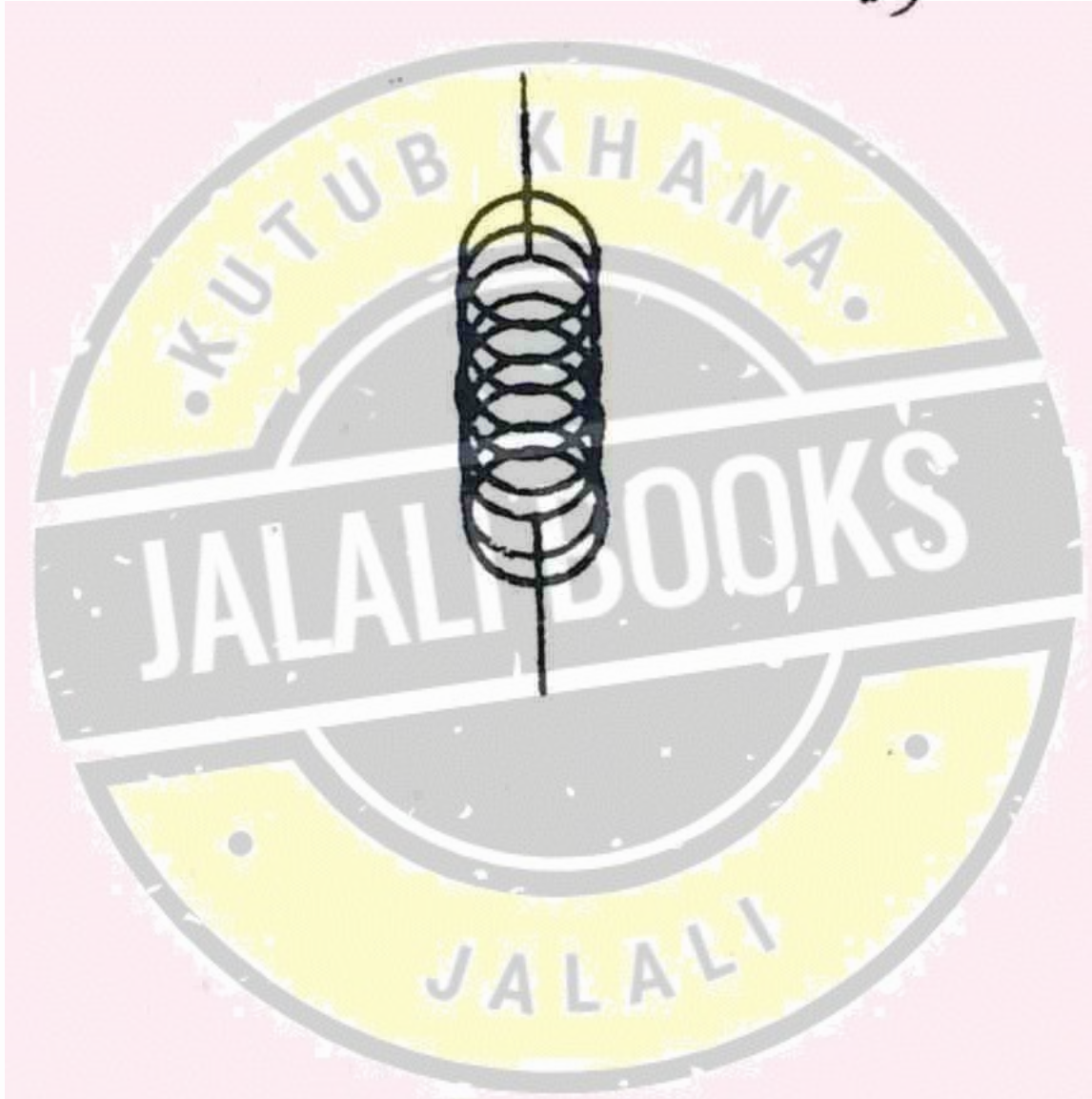
گھر کی مُرغی

گھر کی مرغی ہمیشہ بدمزہ ہوتی ہے۔

چاہے کتنے ہی اہتمام سے کیوں نہ پکوائی جائے، اور کتنے ہی بڑے باورچی کی خدمات کیوں نہ حاصل کی جائیں، صرف ایک آنچ کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ کبھی تو سالن سیٹھا محسوس ہوگا۔ اور کبھی یوں محسوس ہوگا جیسے نمک بہت ڈال دیا گیا ہے۔ اور جہاں یہ دونوں چیزیں برابر برابر ہوں وہاں کسی اور شئے کی کمی یا زیادتی کا احساس ہوگا۔ اور کھاتے ہوئے کوفت ہوگی۔ لیکن یہی مرغی اگر پڑوس میں پکی ہے اور سالن واقعی کھارا یا سیٹھا ہوگیا ہے تو بھی بڑی مزہ دار معلوم ہوگی۔ کیونکہ ہانڈی کے بدل جانے سے ذائقہ ہی نہیں بدلتا بلکہ مقام کی تبدیلی سے بھی مزہ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے اور باہر کی مرغی ۔۔۔

ذہین اور سمجھ دار لوگ کبھی گھر کی مرغی کو ذبح نہیں کرتے۔ ہمیشہ دوسروں کی مرغیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی مرغی کھانے کو جی چاہتا ہے تو اپنے کسی دوست کے یہاں یا کسی رشتہ دار کے گھر چلے جاتے ہیں۔ اور دل کھول کر مرغی کی تعریف کرتے ہیں۔ اس پر میزبان بھی خوش ہوتا ہے اور مہمان بھی۔ مفت میں کسی بے چاری مرغی کے گلے پر چھری پھر جاتی ہے۔

مرغی کھانا بعض کی ہابی ہوتا ہے۔ اور بعض کو صرف مرغی پالنے کا شوق رہتا ہے اور یہ دونوں شوق اپنے اپنے انتہا پسندانہ رویئے کی وجہ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے کھانے والا کبھی مرغی پالتا نہیں اور پالنے والا کبھی کھاتا نہیں۔ بلکہ اس تصور سے مرغی کو چھونا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ لہٰذا مرغی رکھتے ہوئے بھی مرغی اس کی محرومی بن جاتی ہے۔

مرغی کھانے اور مرغی پالنے پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ دونوں فعل اپنے محدود دائرہ عمل میں ہابی کی تعریف میں آتے ہیں۔ لیکن مرغیاں پالنا تیسری ترقی یافتہ دنیا کی طرف اٹھتا ہوا ایک مثبت قدم ہے۔ اس نفع بخش کاروبار کو شروع کرنے سے پہلے لوگ اپنا یا اپنی بیویوں کا ہاتھ جوتشی کو دکھاتے ہیں۔ اور کسی مبارک دن اور تاریخ اس قومی کام کو شروع کرتے ہیں جسے سائنس کی زبان میں "پولٹری فارم" کہا جاتا ہے۔

لیکن اس کاروبارِ شوق میں ہر کوئی سرخرو نہیں ہوتا جس کے ستارے اونچے ہوتے ہیں اسے یہ کاروبار راس آتا ہے۔ ورنہ اکثر حضرات تھک ہار کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور دنیا کو کبھی اپنی صورت نہیں دکھاتے۔

عقلمند آدمی سرکار سے قرضہ لے کر پولٹری فارم کھولتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ جلد سے جلد اس کا دیوالیہ نکال دے۔ بے وقوف اپنی رفیقۂ حیات کے زیور بیچ کر اپنا منہ کالا کرتا ہے۔ اور ان دونوں کے بیچ میں ایک شخص اور ہوتا ہے جسے اردو میں حصہ دار اور انگریزی میں پارٹنر کہتے ہیں۔ یہ تھوڑا سا سرمایہ اصل میں شامل کر کے مالک کے ساتھ برابر مقابل کی کرسی پر شان سے بیٹھ جاتا ہے۔ اور سگریٹ کا دھواں پھونکتے ہوئے یا

پان چباتے ہوئے مالکانہ حق حاصل کرتا رہتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دو ملاؤں میں مرغی مردار ہو جاتی ہے ۔

اور بچے ہوے انڈے محلے والے اپنا حق سمجھ کر بانٹ لیتے ہیں ۔

مرغیاں قسم قسم کی ہوتی ہیں ۔ اونچی لمبی، دبلی پتلی، موٹی تازی، بونی لونی، کالی سفید، حسین اور بدصورت ۔ لیکن سب سے اچھی مرغی وہ سمجھی جاتی ہے جو انڈہ دیتی ہے ۔ اس کی ذات اور صورت کو کوئی نہیں دیکھتا ۔ اور نہ اس کے کردار پر کسی کی نظر جاتی ہے ۔

شریف مرغیاں اس کرۂ ارض کے ہر خطہ میں پائی جاتی ہیں ۔ ان کی اور غیر شریف مرغیوں کی پہچان یہ ہے کہ شریف مرغیاں دن بھر اڑوس پڑوس اور محلے کے گھروں میں گھومتی پھرتی ہیں ۔ اور جب انڈا دینے کا وقت آتا ہے تو وہ بھاگی بھاگی اپنے گھر چلی آتی ہیں اور چلا چلا کر پورے گھر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں ۔ اور پھر بڑے اطمینان سے اپنے ڈربے میں انڈا دیتی ہیں ۔ اس کے برعکس غیر شریف مرغیاں دن بھر اپنے گھر میں رہتی ہیں ۔ اپنے آقا کی فراہم کی ہوئی غذا کھاتی ہیں ۔ اور بلی کی طرح دبے پاؤں چپکے سے جا کر پڑوسی کو نواز آتی ہیں، اور بے چارے صاحب خانہ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کی پیٹھ پیچھے کیا ہو رہا ہے ۔

بے وفائی کی ایسی مثالیں زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ۔ اس لئے اس پر کسی کو کوفت کھانے کی قطعی ضرورت نہیں ۔ البتہ اس سے سبق حاصل کر کے لوگوں کو چاہئے کہ توبہ اور استغفار پڑھیں ۔ یہ عبرت کا مقام ہے ۔ اس کے بعد صدق دل کے ساتھ خود کو خدا سے رجوع کریں ۔

ہائے ہائے ۔ قیامت کا زمانہ قریب آ رہا ہے، آثار شروع ہو چکے ہیں ۔ دیکھئے مرغیاں بغیر مرغ کے انڈے دے رہی ہیں ۔

اور مرغ گلی کوچوں اور کوڑا کرکٹ کے آس پاس گھوم رہے ہیں ۔

اور بچے بغیر ماں کی آغوش کے انڈوں میں سے برآمد ہو رہے ہیں ۔

اور اب کوئی مرغی کُڑک نہیں ہوتی

اگر ہوتی بھی ہے تو پتہ نہیں چلتا ۔ ہر ایک چہرے پر تازگی نظر آتی ہے ۔ تھکاوٹ کا دُور دُور تک پتہ نہیں چلتا ۔ جسم اور چال سے کوئی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا ۔ بوڑھی بھی جوان نظر آتی ہے ۔ اور جوان بھی جوان ۔ اس لئے ان دونوں میں فرق کرنا ممکن نہیں ۔ اور مرغوں میں اتنا سلیقہ نہیں ہوتا کہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکیں ۔

نوٹ :۔ ہوشیار اور معاملہ شناس مرغ اس سے مستثنیٰ ہیں ۔ اس لئے انھیں بُرا نہیں ماننا چاہئے ۔ اور یوں بھی یہ کلیہ ان پر لاگو نہیں ہوتا ۔ یہاں عام بات ہو رہی ہے ۔

آج بھی مُرغ پالنا شرافت کی علامت سمجھا جاتا ہے ۔ پہلے زمانے میں چونکہ شرافت زیادہ تھی اور ڈھیروں شرفاء ہر محلے اور گلی کوچے میں دستیاب ہوتے تھے اس لئے وہ مرغ پالتے تھے یا مُرغ لڑاتے تھے ۔ لیکن ان دونوں کے کردار کا یہ عالم تھا کہ وہ کبھی کسی مُرغی پر بری نظر نہیں ڈالتے تھے اور نہ اپنے مکان میں کسی مرغی کو گھسنے دیتے تھے ۔ ان کی ساری وفاداریاں مرغوں کے ساتھ تھیں ۔ ان کا جینا مرنا ، غرض زندگی کا ہر کاروبار اس سے عبارت تھا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی حکومتیں ان کی شرافتوں سے متاثر ہو کر ان کے نام وظائف جاری کرتی تھیں ۔ اور یہ دنیاداری کے جھمیلوں سے بے نیاز ہو کر مرغوں کو لڑانے کی نئی نئی تکنک پر غور کیا کرتے اور باقاعدہ منصوبے اور پروگرام کے تحت لڑائی کا اعلان کرتے ۔

پانی پت کی لڑائی کس نے دیکھی ہے جس کا حوالہ دیا جائے ۔ لیکن مرغوں کی لڑائی تو سب نے دیکھی ہے ۔ یہ صرف مرغوں کی لڑائی نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ دو انسانوں ، دو خاندانوں اور دو قبیلوں کے درمیان ہوتی تھی ۔ اور اسے دیکھنے کے لئے سارا شہر امڈ پڑتا ، جیتنے والے کے وارے نیارے ہوتے اور ہارنے والا پھر اپنے مرغ کو کھلا پلا کر دوسری لڑائی کے لئے تیار کرنے لگتا تاکہ شکست کا بدلہ لیا جائے ۔ اگر مفتوح اس بیچ میں اللہ کو پیارا ہو جاتا تو

اس کے فرزند ارجمند پر یہ اخلاقی ذمہ داری عاید ہوتی تھی کہ اپنے مرحوم باپ کی شکست کو فتح میں بدل دے۔ اور اس کی رُوح کو خوش کرے۔ ایصالِ ثواب کا یہی ایک عام طریقہ تھا۔

جس گھر میں اچھا توانا اور بہادر مُرغ ہوتا وہ صرف صاحبِ خانہ کی ناک نہیں بلکہ محلّے کی ناک اور شرفار کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔

ہمارے ملک جنت نشاں میں اب بھی مُرغ لڑائے جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والے ان بہادر سپاہیوں کو اصیل مرغ کہا جاتا ہے۔ یہ اونچے پورے اور توانا ہوتے ہیں۔ لڑائی کے وقت ان کے پاؤں کے بڑھے ہوئے ناخنوں پر چاندی کی پتلی پتلی پٹیاں منڈھ دی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ دشمن کو لہولہان کرسکیں۔ نکیلی چونچ، تیز اور زہر میں بجھے ہوئے تیر کا کام کرتی ہے۔ ان کے علاوہ جو باقی بچ جاتے ہیں وہ اصیل نہیں ہوتے، صرف مرغ ہوتے ہیں جن کا کام صرف بانگ دینا ہوتا ہے اور اڑوس پڑوس میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنا۔ ان سے پکائی ہوئی نہاری بڑے مزے کی چیز ہوتی ہے۔ اور یہ برصغیر کی ایک اہم ڈش ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل مرغ کے نام سے مرغیوں کو استعمال کیا جارہا ہے۔ لیکن کیا مجال جو کوئی یہ پہچان لے کہ یہ بھری بھری صحت مند ٹانگ مرغ کی ہے یا مرغی کی۔

مرغ اپنے حلقۂ اثر میں تاج والا بادشاہ ہوتا ہے۔ جہاں جائے اس کی قدر ہوتی ہے۔ پہلے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ ایک مرغ کی آواز پر درجنوں مرغیاں لبیک کہتی ہوئی دوڑی آتی تھیں۔ لیکن ـــــ

لیکن آج ایک مرغی کی ہلکی سی آواز پر درجنوں مرغ دوڑ کر قریب آجاتے ہیں اور رقص کرنے لگتے ہیں۔

کُگ ـــ کُگ ـــ!

ککڑکوں ـــ کوں ـــ ککڑکوں ـــ کوں ـــ!!

اب تو سُنا ہے کہ مغربی ممالک میں مرغیاں بانگ دینے لگی ہیں۔ اور اپنے ملک میں مرغ بانگ دینا بھول گئے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ توبہ، استغفار کیجیے ـــ اور صدق دل کے ساتھ خدا سے رجوع کیجیے۔

ویسے بغیر بانگ کے بھی صبح برابر ہو رہی ہے ـــ!
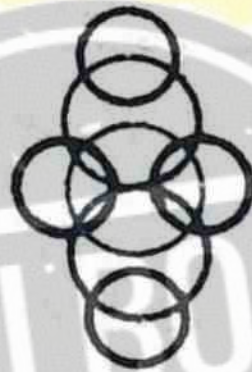
انگوٹھا چوسنا

انگوٹھا چوسنا سچ پوچھئے تو ایک آرٹ ہے۔

ورنہ پہلے اسے ایک نفسیاتی بیماری کا نام دیا گیا تھا۔ اور اس بیماری میں بتلا ہونے والے یا اس کا شکار ہونے والے عموماً بچے ہوتے تھے۔ اور ان کی عمر یں دو تین مہینے سے شروع ہو کر ڈیڑھ دو سال تک جاتی تھیں۔ اگر کوئی یہ سوال پوچھ بیٹھے کہ صاحب دو تین مہینوں کی عمر سے یہ بیماری کیوں شروع ہوتی ہے، پہلے سے کیوں نہیں یا پیدائش کے ساتھ ہی کیوں نہیں تو اس خصوص میں ہمارا خیال ہے کہ پہلے تو بچہ دودھ پینے کی پریکٹس کرتا ہے اور بعد میں انگوٹھا چوسنے کی۔

ویسے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ انگوٹھا چوسنا ایک ایسا عمل ہے جو بچّہ یا بچی کی جذباتی تشنگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس تشنگی کو عمر کی قید میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

کیونکہ دو سال کا ذکر ہی کیا پندرہ اور سولہ سال کی عمر تک بعض ایسی لڑکیاں اور لڑکے نظر آتے ہیں جو انگوٹھا چوستے رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم نے بعض ایسی معمر خواتین کو بھی دیکھا ہے جو اپنی عمر کی چالیسویں سالگرہ منانے کے بعد بھی انگوٹھا چوسنے کی عادت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکیں۔ ویسے اگر منہ میں انگوٹھا بھی نہیں ہے یا شعوری کوشش سے انھوں نے اس عادت سے نجات بھی حاصل کر لی ہے تو ان کے ہونٹ اپنے اس عمل کو باقی رکھیں گے۔ یعنی مسلسل حرکت میں رہیں گے۔ جیسے لبوں کے اوپری حصے میں کچھ جلن سی ہے اور اسے اندر ہی اندر محسوس کر ٹھنڈا کیا جا رہا ہے۔ یا پھر جیسے کوئی بچہ نیند میں نپل کو چوستا رہتا ہے۔ خواتین پر کیا منحصر مردوں میں بھی یہ عادت دیکھی گئی ہے۔ یوں بھی انگوٹھا چوسنا انتہائی معصومیت اور پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک میں جہاں کئی صحت مند تبدیلیاں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یکلخت بچوں نے انگوٹھا چوسنا چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ نہ ہاتھ کا انگوٹھا چوستے ہیں نہ پیر کا۔ البتہ اس معصوم عادت کا شکار دن بہ دن بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے پڑوس کا سامنے والا گھر پیش خدمت ہے: ملاحظہ ہو۔
ورانڈے میں باپ پلنگ پر لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ ماں پنگوڑے میں چت لیٹی ہوئی غوں غاں کر رہی ہے۔ نوکر ڈرائنگ روم میں سگریٹ کے کش کھینچتا ہوا ریڈیو سن رہا ہے گھر کی بچی دال بگھار رہی ہے۔ لڑکا صحن میں جھاڑو لگا رہا ہے اور باپ کی طرح دلدادہ بھی انگوٹھا چوسنے میں مصروف ہے۔

اب آپ اسے مذاق میں نہ ٹالیں بلکہ سنجیدگی کے ساتھ علمی انداز میں پڑوس اور اس کے افراد خاندان کی نفسیات کا تجزیہ کریں تو ہو سکتا ہے کہ آپ اس کی کڑیاں فرائیڈ سے ملائیں یا پھر فلسفۂ وجودیت پر ایمان لے آئیں۔ یا پھر کوئی ایسی تصویری پیش کریں جو دنیا میں ایک

تہلکہ مچا دے۔ اور آپ کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے۔ بہرحال آپ کا رویہ مسئلہ کے تعلق سے مثبت ہو یا منفی لیکن آپ ضرور اس سچائی کا اعتراف کریں گے کہ خاندان کا ہر فرد ماشاء اللہ اور سبحان اللہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ غور کرتے جائیں تو آپ کے ذہن کے کمینوس پر ایسے کئی مردوں اور عورتوں کے کردار ابھریں گے۔ جو اس معصوم اور مقدس عادت میں مبتلا ہیں۔ اور جنھیں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کسی سے پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ یہ عادت ان میں کیونکر پیدا ہوئی۔ محض اس لئے کہ یہ سوال مفاد عامہ کے خلاف ہے۔

جذباتی تشنگی اور محرومی کا اظہار آدمی مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔ اس کا کوئی ایک بندھا ٹکا میڈیم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ بچپن میں اگر آسودگی نصیب نہ ہو تو لڑکپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تشنگی آدمی کو تڑپاتی رہتی ہے۔ اور اس تناؤ کو کم کرنے کے لئے وہ ہمیشہ انگوٹھا چوستا رہتا ہے۔

لیکن اسے آرٹ کا درجہ دینے والے وہ اشخاص کبھی بھلائے نہیں جا سکتے جنھوں نے اس فن کی ہمیشہ ہمت افزائی کی ہے۔ اور انگوٹھا چوسنے والوں کی پیٹھ ٹھونکی کہ شاباش شاباش اسی طرح انگوٹھا چوستے جاؤ۔ کیونکہ انگوٹھا چوسنا صحت مند اور خوشحال زندگی کی علامت ہے۔

چنانچہ اب یہ آرٹ اتنا پوپلر ہو گیا ہے کہ ہر چھوٹا بڑا شخص آرٹسٹ بن گیا ہے۔ صرف تہذیبی سطح پر نہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور عالمی سطح پر کئی ترقی یافتہ ممالک انگوٹھا چوسنے کی ٹریننگ دینے کے لئے اپنی اپنی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ ایک شعبہ کھول بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اقوام متحدہ سے تعلق رکھنے والی اکثر قومیں انگوٹھا چوس رہی ہیں۔ اور دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے بڑے بڑے رہنما اپنے کارخانوں میں جنگی ہتھیار تیار کر کے انگوٹھا چوسنے والوں کی گہری قبریں کھود رہے ہیں۔ جو اس کے لئے ملاحظہ ہو دنیا کا نقشہ۔ ویسے انگوٹھا چوسنا سچ پوچھئے تو ایک آرٹ ہے۔

انڈین کاجو

اگر آپ کا پیٹ بھرا ہوا ہے تو تفریحاً کاجو کھائیے۔

ورنہ صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ یعنی آپ بھوکے ہیں اور قرض کی کہیں سے اُمید نہیں تو پریشان مت ہوئیے بلکہ اطمینان سے کاجو کھائیے اور اس وقت تک کھاتے رہئے جب تک آپ کا پیٹ نہ بھر جائے۔ اور آپ ایک نئی توانائی کے ساتھ زندگی کے دوسرے کاموں میں مسکراتے ہوئے حصہ نہ لے سکیں۔ کاجو سارے وٹامنس اور پروٹینس کا مجموعہ ہے اور اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ ہمارے ملک کا سب سے سستا میوہ ہے۔ سیب انار، انگور اور اخروٹ کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ پہلے یہ کشمیر کی وادیوں میں پیدا ہوتا تھا، لیکن آج کل جنوبی ہندوستان اور دکن کے میدانوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایٹمی تجربے اور موسمی تبدیلیاں اسے راس نہیں آئیں۔ مگر اس کے باوجود اس کی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کاجو عوامی

میوہ بن گیا جس کو عرفِ عام میں مونگ پھلی کہتے ہیں ۔

مونگ پھلی کو مونگ پھلی کہنا مونگ پھلی کی توہین ہے ۔ ذاتی طور پر مجھے خود بھی اس نام سے اختلاف ہے ۔ ایک اچھی خاصی مزیدار شئے کو ایسا ویسا نام دینا آخر کہاں کی دانشمندی ہے ۔ آپ ہی غور فرمائیے اگر آپ اپنے معزز مہمان کی خدمت میں مونگ پھلی کو مونگ پھلی کے نام سے پیش کریں تو کیا وہ نہیں ٹپٹائے گا ۔ اگر وہ حساس ہے تو خود آپ کی اور اپنی پوزیشن پر غور کرتے ہوئے واک آوٹ کرے گا ۔ لیکن اس کی بجائے اگر آپ فرمائیں، لیجئے کاجو حاضر ہے ۔۔ تو یقیناً آپ ایک مثبت ردعمل کو محسوس کریں گے ۔ وہ نہ صرف مسکراتا ہوا مونگ پھلی سے شوق کرے گا بلکہ آپ کے ذوق کی داد دے گا ۔ بنانے والے یا بنانے والی کی تعریف کرے گا ۔ اور مزید کاجو کی فرمائش کرے گا ۔

ظاہر ہے کہ اس میں بے چاری مونگ پھلی کا کوئی قصور نہیں بلکہ قصور اس غلط نام کا ہے جو اس کی پیشانی پر چپکا دیا گیا ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں ایک ایسی سوسائٹی یا انجمن کی بنا ڈالی جائے جو اس غلط نام کے خلاف آواز اٹھائے ۔ اور مونگ پھلی کو ملک کی عوامی زندگی میں اس کا جائز مقام دلائے ۔ انسانوں میں ہریجن اور میووں میں مونگ پھلی ہی ایک ایسی واحد شئے ہے جسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ حالانکہ ان دونوں کے بغیر قومی زندگی کی گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ ویسے ہریجنوں کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ سوچا جا رہا ہے، لیکن مونگ پھلی کے بارے میں ۔۔۔ ؟

آپ مجھ سے پوچھیں تو میں عرض کروں کہ مونگ پھلی کا قومی زندگی میں بڑا اہم رول ہے امیر غریب، سیٹھ ساہوکار، بچہ بڑا، بوڑھا جوان، مرد عورت غرض سب ہی اسے منہ لگاتے ہیں ۔ اور یہ کافر ہے ہی ایسی کہ منہ لگنے کے بعد چھٹتی نہیں ۔ غالب نے مونگ پھلی کے تعلق سے کچھ نہیں کہا ۔ پتہ نہیں مونگ پھلی کا رواج تھا یا نہیں ۔ لیکن غالب سے ذرا پہلے نظیر اکبرآبادی کے دور میں یہ شاعروں کی محبوب نظر تھی ۔ سُنا ہے کہ نظیر کی عوامی شاعری میں

مونگ پھلی کو بڑا دخل ہے۔ چنانچہ ہر مقبول نظم کے پیچھے مونگ پھلی ہے۔ اور وہ نظمیں ایسی ہی پھُس پھُسی رہیں جنھیں شاعر نے بغیر مونگ پھلی کھائے کہی تھیں۔ بہر حال مونگ پھلی کا اُردو شاعری میں کیا مقام ہے ایک دوسری بحث ہے اور کوئی ریسرچ اسکالر ہی تفصیل سے آپ کو بتائے گا۔ میں تو صرف مونگ پھلی کے قومی کردار کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ بڑے بڑے شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے قریب رہی ہے اور ہے۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں میں ایک ایسے فن کار سے واقف ہوں جو وقت واحد میں شاعر بھی ہے، افسانہ نگار بھی۔ صحافی بھی ہے اور مصور بھی اور کارٹونسٹ بھی۔ اور جس کا گھر صحیح معنوں میں یہ ساری دنیا ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں موقع ملے وہ سو جائے گا، آج میرے پاس تو کل آپ کے پاس اور پرسوں کسی اور کے پاس۔ اصل بات جو میں اس فن کار کے تعلق سے آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ اس کی میلی کچیلی پتلون کے دو جیب ہیں جو ایک بنئے کی توند کی طرح ہمیشہ پھولے ہوئے رہیں گے۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ ان جیبوں میں کیا چیز ٹھنسی ہوگی!

جی ہاں۔ وہی مونگ پھلی جسے فن کار مصافحے کے فوری بعد مسکراتے ہوئے آپ کی خدمت میں پیش کرے گا۔ اخلاق اخلاق میں اگر آپ کھا گئے تو پھر آپ کی خیر نہیں۔ فن کار آپ کو مشورہ دے گا کہ مونگ پھلی کھانے کے بعد ہمیشہ چائے پینی چاہئے جو صحت کے لئے مفید ہوتی ہے۔ آپ نہ صرف راضی ہو جائیں گے بلکہ اُلٹا میزبان بن کر اسے دعوت دیں گے اور ہوٹل پہنچتے پہنچتے چائے کے ساتھ اور چیزوں کا بھی اضافہ ہو جائے گا جس کا آپ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس طرح فن کار مونگ پھلی جیسی حقیر شئے کی مدد سے اپنے دن بھر کے اخراجات کسی نہ کسی طرح آپ کی جیب سے پورے کر لے گا۔

مونگ پھلی، سچ پوچھئے تو دوستی کی ایک علامت ہے اور آپ اس علامت کا استعمال بلا تکلف جہاں چاہیں اور جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ اور یہ جنسِ لطیف آپ کو ہر گلی کوچے

اور سڑک پر آسانی سے میسر آئے گی۔ بشرطیکہ آپ اونچی آواز میں طلب کر سکیں۔ مونگ پھلی بیچنے والا زن سے اپنی دبابہ جیسی گاڑی کو لڑھکاتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا اور بغیر کچھ پوچھے گرم گرم مونگ پھلی کی ایک پڑیا آپ کے ہاتھ میں تھما دے گا۔

۲۵ پیسے چھٹانک ــ سڑک پر

۳۰ پیسے چھٹانک ــ اسکول اور کالج کے سامنے

۳۵ پیسے چھٹانک ــ سینما کمپاؤنڈ میں

مونگ پھلی دنیا کی وہ عجیب و غریب شئے ہے جس کی قیمت آج تک کوئی متعین نہ کر سکا مثال کے طور پر اگر آپ اس مونگ پھلی کو بمبئی کی چوپاٹی پر کھانا چاہیں تو چھٹانک کے لئے آٹھ آنے نذر کرنے پڑیں گے۔ اور گیٹ وے آف انڈیا پر صرف چار آنے۔ اس کی قیمت مقام کی اہمیت کے ساتھ بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ حالانکہ شئے وہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کہیں چمکیلے لفافے میں پیش کی جاتی ہے اور کہیں اخبار کی ردی میں۔ اس کی بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ پورے ملک میں اس کی ایک معیاری قیمت نہیں۔ مارکٹنگ، اگریکلچر اور کامرس کے محکموں کے لئے مونگ پھلی بھی ایک دعوتِ فکر ہے۔

ساتھ ساتھ ملک کے معزز رہنماؤں کے لئے موضوعِ بحث بھی۔ کیا اپوزیشن کے معزز ارکان اس بات سے واقف نہیں کہ کس طرح آج ملک میں مونگ پھلی کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ناپسندیدہ شہری مونگ پھلی کو بڑے اناڑی انداز میں کھاتے ہیں۔ اور جگہ جگہ اس کے چھلکوں کو پھینک دیتے ہیں۔ خاص طور پر پبلک مقامات پر ایسے تکلیف دہ مناظر ہر وقت نظر آتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو سینما ہال، گارڈن، بسیں، بس اسٹانڈ، ریلوے پلیٹ فارم اور ریلوں میں دیکھئے۔ حد تو یہ ہے کہ ہوائی جہازوں میں بھی مونگ پھلی کے چھلکے ملتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ جس جہاز میں زیادہ چھلکے ملیں اس جہاز سے یقیناً مشہور فلم ایکٹریس مس چاند تارہ نے سفر کیا ہوگا۔ اور مس تارہ کی واحد ہابی مونگ پھلی ہے۔ چنانچہ وہ جب کبھی بمبئی سے مدراس اپنے

کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے بذریعہ طیارہ جاتی ہے تو رات بھر وہ مونگ پھلی، چنے کے دانوں کی طرح چبائی جاتی ہے اور جہاز لینڈ کرنے کے بعد اپنے استقبال کرنے والوں پر جہاں مسکراہٹیں بکھیرتی ہے وہیں مونگ پھلی بھی۔

آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ شاید میں نے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے حقیقت یہ ہے کہ میں بھی مس تارہ کو اتنا ہی پسند کرتا ہوں جتنا کہ آپ۔ قسم لے لیجئے اگر میں نے اس کی کوئی فلم مس کی ہو۔ مجھے مس تارہ کی ہابی پر قطعی اعتراض نہیں۔ مس تارہ مونگ پھلی کھائے، اور شوق سے کھائے۔ لیکن سلیقے اور تہذیب سے کھائے۔ مس تارہ اور مس تارہ کی طرح ہزاروں لوگ مونگ پھلی کا استعمال کرتے ہوئے چھلکوں کے ساتھ جس بے دردی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ قابلِ افسوس ہے۔ کیا چھلکوں کا یوں ہی ضائع ہو جانا ہماری قومی دولت کا نقصان نہیں؟ ہمارے نیتاؤں کو چاہئے کہ وہ ایک آل انڈیا مونگ پھلی کنونشن طلب کرے اور اس قومی دولت کو بچانے کے طریقوں پر غور کرے۔ اس کے ساتھ یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ عوام کو باشعور کرنے اور مونگ پھلی کے صحیح استعمال سے واقف کرانے کے لئے جگہ جگہ مونگ پھلی سنٹر کھولے جائیں اور اس سے پہلے ہمیں بھی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کوشش کرنی چاہئے۔ کیا حرج ہے اگر ہم اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے ایک مورچہ نکال دیں۔ اور مونگ پھلی زندہ باد کا نعرہ لگائیں۔ اگر ہم اس وقت بھی اپنے جمہوری حق کا استعمال نہ کریں تو پھر کب کریں گے؟

ابھی حال حال کی بات ہے کہ میں ایک ہندوستانی فلم دیکھ رہا تھا۔ بازو کی نشست پر ایک طرحدار خاتون مع اپنے شوہر کے تشریف رکھتی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شوہر صاحب میرے پاس بیٹھتے اور محترمہ کو اس سیٹ پر بٹھایا جاتا جہاں شوہر صاحب تھے۔ لیکن انھوں نے میرے قریب بٹھانا شاید اس لئے گوارا کر لیا کہ اس طرف ایک قد آور پہلوان قسم کے صاحب تشریف رکھتے تھے۔ اور جن کی نکیلی مونچھیں، دیکھنے والوں پر خوف طاری کر دیتی تھیں۔ اور میری طرف کی فضا پرسکون تھی۔ بہرحال اس حد تک میں ان کا ممنون ہوں۔ اور اس لئے بھی کہ مجھے

ان کے ڈائیلاگ سننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بیوی صاحبہ مونگ پھلی کھا رہی تھیں اور ہر پانچ منٹ کے بعد اپنے شوہر کی خدمت میں بھی پیش کر رہی تھیں۔ لیکن جہاں تک چھلکوں کا تعلق تھا وہ بڑی احتیاط سے اپنی ٹرلین کی نفیس گلابی رنگ کی ساڑی کے آنچل میں جمع کر رہی تھی۔ شوہر کو اپنی بیوی کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ اندھیرے میں اس کی آواز ابھری۔

"آخر تم یہ کیا کر رہی ہو؟ کہیں پاگل تو نہیں ہوگئیں۔ چھلکے پھینک دو۔ پھینک دو۔"

دوسری آواز آئی "نہیں پھینکوں گی۔۔!"

پہلی آواز نسبتاً اونچی تھی "پھینک دو۔۔ پھینک دو۔۔ انٹرول میں لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟"

"ارے واہ کیوں پھینکوں۔۔ کسی کا ڈر ہے۔۔؟"

"مگر ان چھلکوں کا تم کیا کروگی؟"

"چولھا جلاؤں گی۔۔ چھٹ پٹ۔۔ ایک سکنڈ میں۔"

فلم چل رہی تھی۔ اسکرین پر مس تارہ کا ڈانس ہو رہا تھا اور وہ گا رہی تھی۔۔ میں تو ہوگئی رے۔۔۔۔

اوپر کا ڈائیلاگ اس مسئلے کی سمت ایک اہم قدم ہے۔ نیشنل پلیٹ فارم پر کام کرنے کرنے والے یقیناً اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور لکڑی اور کوئلے کی قیمتیں بڑھا کر چھلکوں کا کاروبار کرنے والوں کو ترقی کرنے کے مساوی مواقع عطا کریں گے۔

ویسے مونگ پھلی کا کاروبار کرنے والے لکھ پتی بن گئے ہیں۔ مونگ پھلی آئیل ملز ملک کی اہم انڈسٹری ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو چولھے پر پکنے والی دال بغیر بگھار کے رہ جائے۔ قسم قسم کے اچار اور چٹنیاں اپنا مزہ کھو دیں۔ میکدے کی آدھی رونق ختم ہو جائے۔ تلن نام کی چیز کو لوگ بھول جائیں۔ ویسے کرڑ کا تیل بھی کچھ کم نہیں لیکن مونگ پھلی کے تیل کی شان ہی کچھ اور ہے۔ نقلی اور اصلی مونگ پھلی تیل کی پہچان کے لئے ان ٹریڈ مارکس سے

واقف ہونا ضروری ہے جو آئیل ملز کی طرف سے وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان مالکان میں سے بعض غیر معمولی ذہین ہیں جنھوں نے حال حال میں سائنٹفک طریقے سے مونگ پھلی میں کروڈ آئیل ملا دیا۔ اور اس کے استعمال کے بعد کئی لوگ دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کاروبار میں جینا اور مرنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ یوں بھی بزنس اور محبت میں ہر چیز جائز ہے۔ مجھے ان کے کروڈ آئیل ملانے پر اعتراض ہے اور نہ ان نامعلوم حضرات کی موت کا دکھ ہے جو ملاوٹ کا شکار ہوئے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ اگر وہ اس نقلی تیل کے استعمال سے نہ مرتے تو کسی سڑک پر ان کی موٹر سے ٹکرا کر مر جاتے مرحومین کے لواحقین کو ان مل مالکوں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے بازار کی سستی موت کی بجائے انھیں ایک باعزت موت عطا کی۔ اور یوں بھی وہ گھڑی ٹل نہیں سکتی تھی۔ مجھے جو اعتراض ہے یہی کہ انھیں کروڈ آئیل بھی برابر ملانا نہیں آیا۔ ملاوٹ بھی ایک آرٹ ہے۔ اور یہ آرٹ انھیں چاول کے بیوپاریوں سے سیکھنا چاہیئے جو ایک تھیلے میں پچیس کلو کنکر ملا دیتے ہیں اور اس صفائی سے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ منہ میں کنکر آجائے تو تھوک دیجیے اور مزے سے دوسرا نوالہ چبائیے۔ نہ مرنے کا ڈر، نہ پولیس کا خوف اور نہ عدالت کے جھگڑے۔ بزنس کا بزنس اور فائدہ کا فائدہ۔ یا پھر ان تاجروں سے سبق سیکھنا چاہیے جو اصلی گھی میں چربی، مرچ پاؤڈر میں لکڑی کا بُرادہ، ہلدی میں لید، اور شہد میں گڑ ملا کر سماجی زندگی میں ایک باعزت مقام حاصل کرتے ہیں۔ لہذا مونگ پھلی کا کاروبار کرنے والے حضرات کو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیئے۔ نہ خود بدنام ہوں اور نہ بے چاری مونگ پھلی کو بدنام کریں۔ دونوں کی بھلائی اسی میں ہے۔

انگریزوں کے زمانے میں مونگ پھلی کا تیل صرف جسم کی مالش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اور غریب سے غریب آدمی گھی سے شوق فرماتا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد عوام پر یہ بات واضح ہو گئی کہ انگریز کتنا چالاک تھا جس نے ایک بڑی نعمت سے محروم رکھا۔ چنانچہ

اب لوگ مونگ پھلی کے تیل کو استعمال نہیں کرتے بلکہ نہار مُنہ پیتے بھی ہیں۔

مونگ پھلی کا تیل سچ پوچھئے تو صحت کے لئے بے حد مفید ہے۔ اس کے مسلسل اور باقاعدہ استعمال سے جسم میں توانائی اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ آپ نے نمکین چہرے دیکھے اور سُنے ہوں گے۔ ہر نمکین چہرے کی کشش کا راز مونگ پھلی کے تیل میں محفوظ ہے۔ جس چہرے پر جتنا زیادہ نمک ہوگا سمجھنا چاہئے کہ وہاں مونگ پھلی کا اتنا ہی زیادہ استعمال ہوا ہوگا۔ ثبوت کے طور پر میں ایک محترم خاتون کی مثال پیش کر سکتا ہوں جن سے ملاقات کا مجھے شرف حاصل ہے۔ اور جو موڈرن ہونے کے باوجود چہرے کے میک اپ میں اِسنو اور پاؤڈر سے زیادہ مونگ پھلی کے تیل کو اہمیت دیتی ہیں۔ چنانچہ جب وہ گھر کے باہر اپنے پرس کو اُچھالتے ہوئے نکلتی ہیں تو دنیا ان کے چھک چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اپنا منہ کھول دیتی ہیں۔

مس انڈیا اور مس ورلڈ کے بارے میں تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا لیکن شُبہ کی گنجائش ہر طرح سے موجود ہے۔ اگر قتل کا ملزم شبہ سے فائدہ اُٹھا کر باعزت رہا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مونگ پھلی آئیل ملز کے بورڈ آف ڈائرکٹرس مس انڈیا اور مس ورلڈ کی خوبصورتی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کریں کہ یہ اصلی چمکتا ہوا رنگ مونگ پھلی کی دین ہے۔ لہٰذا جو لڑکیاں بیوٹی کامپیٹیشن میں حصہ لینا چاہتی ہیں انھیں چاہئے کہ صبح سویرے نہار چار چمچے مونگ پھلی کا تیل پئیں اور اس تیل کی مالش سے اپنے جسم کو چمکائیں ۔۔ بال بڑھانے کے لئے اس سے اچھی اور کوئی ٹانک نہیں۔ دماغ ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

معاف کیجئے بات مونگ پھلی کی ہو رہی تھی اور ذکر تیل کا چھڑ گیا۔ میں سمجھتا ہوں اس کے لئے میں بھی مجبور تھا۔ اور آپ بھی۔ آپ اس لئے کہ اس سے ہٹ کر کوئی دوسری بات سننا چاہتے تھے اور میں اس لئے کہ آپ کا موڈ میرے پیش نظر تھا۔ یوں بھی بات میں بات

نکل ہی جاتی ہے ۔ لہٰذا نہ آپ کو افسوس کرنا چاہئے اور نہ مجھے ۔ اس لئے ہم دونوں کو اپنے اصل موضوع کی طرف لَوٹ جانا چاہئے ۔

جی ہاں ۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مونگ پھلی ہمارے دیس کا سب سے سستا میوہ ہے اور ساتھ ساتھ دوستی کی علامت بھی ۔ شاید میں نے آپ کو اپنے دوست کا وہ واقعہ نہیں سنایا جس نے مونگ پھلی بطور تحفہ پیش کر کے اپنی محبوبہ کا دل جیتا تھا ۔ اس کے بیان کے مطابق ہوتا یہ تھا کہ وہ مونگ پھلی کو لال کاغذ میں لپیٹ کر اپنی محبوبہ کے چھوٹے بھائی کے توسط سے محبوبہ کو بھجوایا کرتا تھا جو اس کے پڑوسی کی اکلوتی لڑکی تھی ۔ جواب میں محبوبہ نصف پھلی کو اپنا حق سمجھ کر رکھ لیتی تھی ۔ اور باقی نصف کو تلنے کے بعد ایک چھوٹی سی پلیٹ میں رکھ کر اپنے عاشق کی خدمت میں پیش کرتی تھی ۔ اس طرح ایک دن وہ بھی آیا کہ محبوبہ بیوی بن گئی اور عاشق شوہر بن گیا ۔ عاشق کا شوہر اور محبوبہ کا بیوی بن جانا عشق کی معراج ہے یا نہیں ایک دوسری بحث ہے ۔ اس وقت صرف ایک چیز کا اظہار مقصود ہے کہ تہذیبی اور رومانی زندگی میں مونگ پھلی کا بڑا اہم رول ہے ۔

آج بھی میرا دوست اور اس کی بیوی جو خیر سے کئی بچوں کے ماں باپ ہیں اس خوب صورت لمحے کو نہیں بھول سکے جو مونگ پھلی سے عبارت ہے ۔

اس رومانی پہلو کے قطع نظر مونگ پھلی کھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔ اللہ جسے توفیق دے وہی کھاتا ہے ، تفریحاً نہ سہی ضرورتاً ہی سہی ۔۔۔!

ساڑی

جو بات ساڑی میں ہے وہ کسی میں نہیں۔
ساڑی خواہ وہ ریشم کی ہو یا کھدر کی، کالی ہو یا سفید —— ساڑی ساڑی ہے
ساڑی میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ لگانا کوئی بچوں کا کھیل
نہیں۔ بڑے بڑے ہیر و قسم کے مرد ایک سرے سے دوسرے سرے تک زندگی بھر سفر
کرتے رہے، لیکن منزل تک پہنچ نہیں سکے۔ اور عمر ختم ہوگئی۔ ویسے ساڑی کی لمبائی
پانچ گز سے چھ گز یعنی آج کی زبان میں کچھ کم پونے چھ میٹر ہوتی ہے۔ کوئی دبلی پتلی خاتون
پونے پانچ میٹر پر اکتفا کرتی ہے۔ اور کوئی پھیلی پھیلی پونے چھ میٹر پر۔ اس کے علاوہ یہ
اپنے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ کہاں اور کیسے سمایا جائے۔
جیساکہ ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ ساڑی میں بڑی وسعت ہے۔ ملاحظہ ہو دوسرے
پیراگراف کی پہلی سطر۔ اس سلسلہ میں عرض کروں کہ ساڑی بلا کسی تخصیص کے ہر

عورت کو اپنی پناہ گاہ میں جگہ دیتی ہے اور سب کو اپنے میں چھپا لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض وقت ساڑی پس منظر میں چلی جاتی ہے اور عورت سامنے آجاتی ہے اور کبھی ساڑی سامنے آجاتی ہے۔ اور عورت ساڑی کی مختلف تہوں میں چھپ جاتی ہے، کھو جاتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ غائب ہوجاتی ہے۔ اور ساڑی یوں نظر آتی ہے جیسے کسی شوکیس کے ہینگر پر لٹکی ہوئی کوئی شئے۔

جی ہاں،

جی ہاں، ساڑی باندھنا ایک آرٹ ہے۔ اور اس آرٹ سے ہر ایک کا واقف ہونا ضروری نہیں۔ بس خدا جسے توفیق دے وہی فن کار کہلائے، ورنہ ساڑی کو جسم کے اطراف صرف لپیٹنے کو باندھنا نہیں کہتے۔ بلکہ کولہوں اور پشت کی سمت اس طرح کس کر سامنے اتنا ڈھیلا چھوڑ دیا جائے کہ دیکھنے والے کی نظر الجھ کر رہ جائے۔ فنی زبان میں اسے "میریاں" کہتے ہیں۔ میریوں کی ایک ایک تہہ اتنی متوازن اور نپی تلی ہو کہ دیکھنے والا یوں محسوس کرے جیسے تیز ہواؤں میں پانی کی لہریں ابھر ابھر کر ساحل کی طرف آرہی ہیں اور سر پٹک پٹک کر کف چھوڑتے ہوئے ختم ہوجاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پیٹھ اور پیٹ کا بڑا حصہ اس طرح نظر آئے جیسے زمین اور آسمان کے آخری کنارے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں۔

یا پھر دیکھنے والے کو ایک ہی نگاہ میں چودہ طبق زمین اور آسمان روشن نظر آئیں۔

اسے ایک ٹریجڈی ہی سمجھئے کہ بعض خواتین کوشش اور لگاتار مشق کے باوجود بھی اس آرٹ کو سیکھ نہ سکیں۔ لہٰذا وہ ساڑی بندھوانے کے لئے کسی نہ کسی کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ جیسے کنگھی کرنے کے لئے ہیر ڈریسر ہوتا ہے یا ہوتی ہے ویسے ساڑی ڈریسر۔ اس کا کام صرف ساڑی باندھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ شخصیت کی مناسبت سے ساڑی کے انتخاب میں ٹکنیکل قسم کے مشورے دینا بھی ۔۔ تاکہ ساڑی اور شخصیت دونوں ساتھ ساتھ

اُبھرے اور ایک دوسرے میں کھو نہ جائے۔

ساڑی ہمارے دیس کی خاص پیداوار ہے۔ مغربی ممالک میں اسے جتنی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ اور اب وہاں کی عورتیں بڑی سج دھج سے اپنے اپنے ڈرائینگ رومس میں ساڑیاں بندھوائے اپنے اپنے شوہروں یا بوائے فرینڈ کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں!

فارن اکسپورٹ کے اس کاروبار میں ایک نہیں کئی فائدے ہوئے۔ اس کی تفصیل ذیل میں مفاد عامہ کے خیال سے پیش کی جاتی ہے:۔

۱۔ فارن اکسچینج کی کمائی

۲۔ مغرب میں مشرقی تہذیب کا پھیلاؤ۔

۳۔ اور ان بے روزگاروں کو نوکریاں جو ساڑی باندھنے کے فن سے واقف تھے۔

لیکن اس کا ایک دوسرا تاریک پہلو بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ساڑی کی بے پناہ مقبولیت نے یہاں کے تاجروں کو اور حریص بنا دیا، اور وہ آہستہ آہستہ ساڑی کو بازاروں سے غائب کرنے لگے، کیونکہ تاجر خواہ وہ ساڑی کا ہو یا کتاب کا زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا چاہتا ہے، اور وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کے اس حریصانہ رویے کا اثر ملک اور قوم پر کیا پڑے گا؟ چنانچہ اب ساڑی اتنی مہنگی ہوگئی ہے کہ اکثر عورتیں پتلون پہن کر کام چلا رہی ہیں۔ اور جنھیں پتلون میسر نہیں وہ ایک دھوتی اور لنگی پر ہی اکتفا کر رہی ہیں۔

لیکن سچ پوچھئے تو یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ ہے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے بخدا ساڑی کے بغیر میں عورت کا تصور نہیں کرسکتا۔ عورت خواہ وہ میلی کچیلی یا پھٹی پرانی ساڑی میں کیوں نہ ہو عورت معلوم ہوتی ہے۔ اور عورت لنگی میں، دھوتی میں یا پتلون میں عورت نہیں بلکہ عورت اور مرد کے سوا کچھ تیسری ہی شئے معلوم ہوتی ہے جس کا کوئی

نام نہیں ہوتا۔ اگر میں اپنی ہی بیوی کو کسی دن پتلون میں دیکھ لوں تو میں اسے قطعی پہچان نہ سکوں گا جب تک کہ کوئی مجھے اس سچائی سے یا حقیقت سے آگاہ نہ کرے۔ اور اس کے بعد بھی شاید مجھے تکلف ہو۔

بہر حال میں پہلے ساڑی کا قائل ہوں اور بعد میں عورت کا۔ دراصل عورت کا سارا امیج ساڑی میں محفوظ ہے۔ کسی پبلک مقام پر ہو یا گھریلو زندگی میں اگر اتفاق سے کسی خاتون کا سرسراتا آنچل، جسم سے چھو جائے تو ذہن اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں اور جسم کا ٹمپریچر دیکھتے ہی دیکھتے بڑھ جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک سوچنے والے دماغ اور ذہن کے لئے آنچل چھو جانے کا تصور ہی کافی ہے۔ اور وہ اتنا رومانٹک ہو جاتا ہے کچھ نہ پوچھئے ہمارے اردو کے ایک شاعر کو مرد کی اس عام نفسیاتی کمزوری کا پتہ تھا۔ لہٰذا اس نے لڑکیوں کو، نوجوان خواتین کو اور بلا تخصیص رنگ و نسل و عمر تمام محبوباؤں کو مشورہ دیا تھا کہ اپنے اپنے آنچل سے پرچم بنالیں۔ شاعر کی یہ پلاننگ کسی ملٹری کے اس جنرل سے ملتی جلتی تھی جو اپنی فوج کو لڑاتے وقت دشمن کی ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ شاعر کا مقصد سچ پوچھئے تو آنچل سے پرچم بنانے کا نہیں تھا، بلکہ آنچل کی لپیٹ میں یا اس کے سائے میں یا اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے کنواروں اور نوجوانوں کی جو فوج تھی انھیں انقلاب کی طرف لانا تھا، اور ایک محاذ پر جمع کرنا تھا، اس لئے اس نے یہ آسان نسخہ تجویز کیا۔

لیکن اب وقت اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اس کے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشان بھی باقی نہیں رہے۔ شاید اس لئے آج کی بعض عورتیں پرچم سے آنچل بنانے کی کوشش کر رہی ہیں، جسم کو چھپانے کے لئے آخر کچھ تو چاہئے۔

ساڑی انسانی تہذیب کی آخری نشانی ہے۔ ساڑی خرید کر بطور تحفہ محبوبہ کو دینا ایک شریفانہ بات کہلاتا ہے، اور بڑی سعادت مندی سے بیوی کی خدمت میں

پیش کرنے کے عمل کو اس گناہ کا کفارہ کہتے ہیں جو ماضی میں دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوا۔

لہنگے کے بغیر ساڑی اور ساڑی کے بغیر لہنگا ایسا ہی ہے جیسے تلوار بغیر نیام کے یا تصویر بغیر نگیٹیو کے۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا عورت کے لئے مرد یا مرد کے لئے عورت۔ جس طرح ساڑی کی کئی قسمیں ہیں ویسے لہنگے کی، مگر شرط ایک ہی ہے کہ دونوں آپس میں میل کھائیں، نہ صرف بناوٹ میں بلکہ رنگ میں بھی۔ کبھی ساڑی کی نمائش مقصود ہو تو لہنگا پس منظر میں چھپ جاتا ہے، ورنہ ساڑی اتنی مہین اور باریک باندھی جاتی ہے کہ اندر سے لہنگا جھلملاتا رہتا ہے، جھل مل جھل مل ـــــ!

ایسی خواتین جو جدیدیت کی حامی ہیں اور کلاسیکل روایتوں کو توڑنا اپنا فرض سمجھتی ہیں، وہ آج کل بغیر لہنگے کے ہی اپنا کام چلا رہی ہیں جس دن یہ رجحان عام ہو جائے اور ساڑی پانچ میٹر سے ایک میٹر پر آجائے اس دن یقین کیجئے کہ ایک خاموش اور چھپتا ہوا انقلاب ہمارے ملک کی سرحدوں میں داخل ہو گیا ـــــ

آم
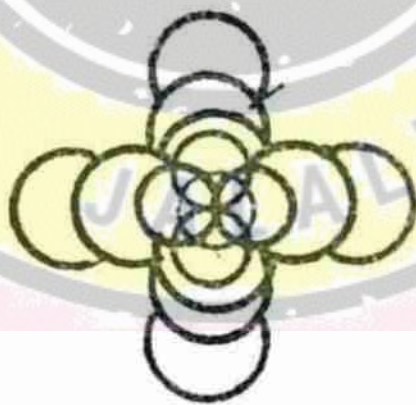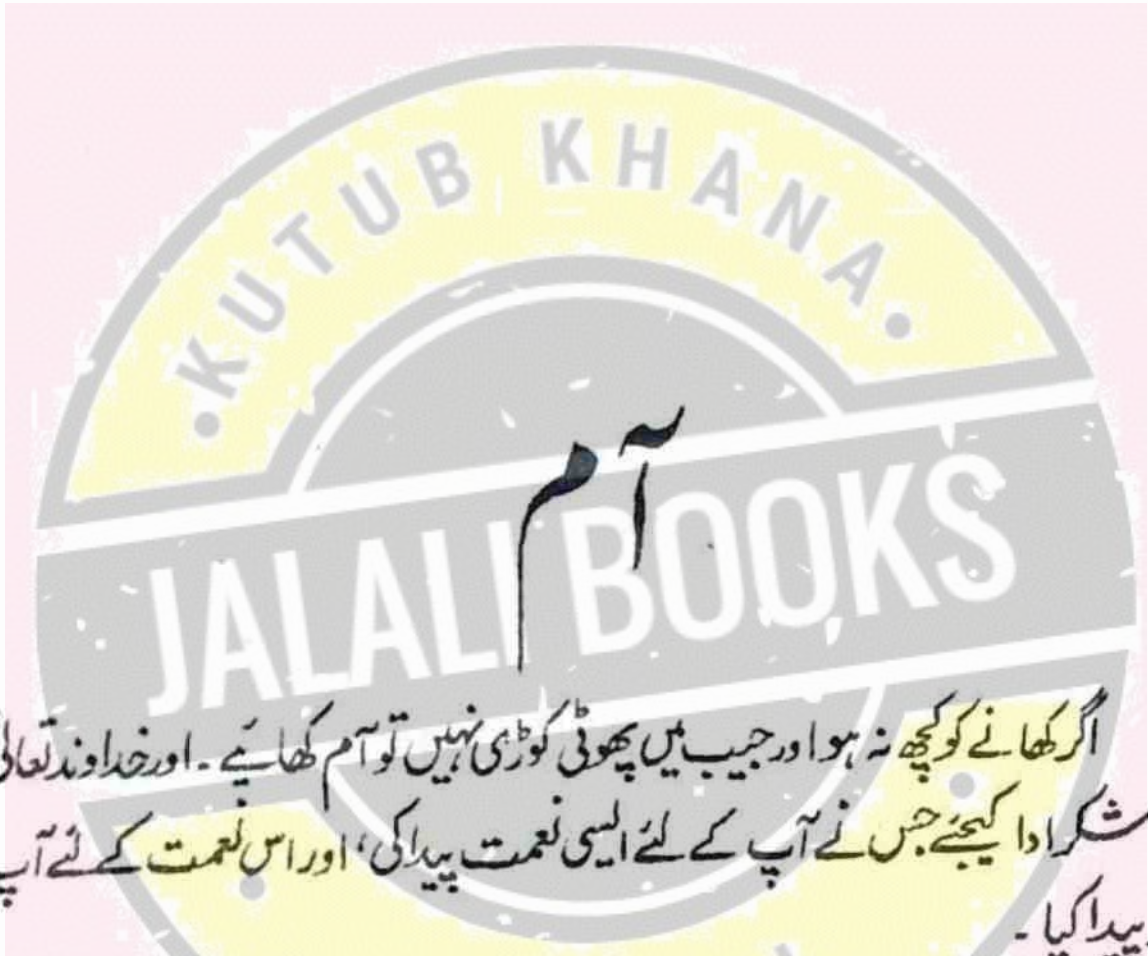
اگر کھانے کو کچھ نہ ہو اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تو آم کھائیے۔ اور خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے جس نے آپ کے لئے ایسی نعمت پیدا کی، اور اس نعمت کے لئے آپ کو پیدا کیا۔

قدرت کے راز سے قدرت ہی واقف ہوتی ہے۔ اور وہ جانتی ہے کہ آم کو انسان کے لئے اور انسان کو آم کے لئے کیوں پیدا کیا گیا۔ دونوں کی تخلیق کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے تعلقات کو آپس میں استوار اور مستحکم کیا جائے۔ ورنہ کہاں آدم زاد اور کہاں آم ــــ!

کسی زمانہ میں اُردو کے ایک شاعر مرزا غالب ہوا کرتے تھے جنھوں نے آم سے عشق ہی نہیں کیا بلکہ اس سے اپنا پیٹ بھرنے لگے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھانا کبھی صحت کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود غالب کی صحت آخر وقت تک اچھی رہی اور

انھوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا کہ آم جام نہیں، جام آم نہیں، آم آم ہے لہٰذا کھائیے، اور سیر ہو کر کھائیے۔ واہ واہ، بجا ارشاد ہوا۔ نثر میں شاعری اسی کو کہتے ہیں ــــ!

غیر منقسم ہندوستان میں آم صرف ہندوستان میں پیدا ہوتا تھا، لیکن تقسیم کے بعد یہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی پیدا ہونے لگا۔ لعنت ہے اس پیداوار پر۔ اپنے ملک سے غداری اسی کو کہتے ہیں۔

وفاداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنے ملک پر قربان ہو جاتا۔ اور دوسروں کی دہلیز پر قدم نہ رکھتا لیکن آموں میں خصوصیت کے ساتھ طوطا پری وہ عام ہے جو طوطے کی طرح اپنی نظریں پھیر لیتا ہے۔ اسے محاورہ کی زبان میں طوطا چشمی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام طوطا پری رکھا گیا ہے۔ اچھے معزز اور اعلیٰ خاندان کے لوگ اسے لفٹ نہیں دیتے۔ ہاتھ لگانا تو بڑی بات ہے چھو کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس لئے طوطا پری فٹ پاتھ کا مقدر بن گیا۔ عورتیں اس پر نظریں نہیں ڈالتیں اگر اس پر اتفاق سے کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ اپنا راستہ بدل کر دوسرے راستے پر چلنے لگتی ہے۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔

بیگن پلی کے آم سے تو عورتیں گھبراتی ہیں۔ بعض تو اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتیں صنفِ نازک کے مزاج پر واقعی یہ ایک بار ہے۔ بد ذوقی کی حد ہو گئی۔ ورنہ کہاں آم اور کہاں بیگن ــــ!

ویسے یہ آم کا نام نہیں ہے، بیگن پلی تو مقام کا نام ہے۔ اور یہ آم مقام کے نام سے مشہور ہے یا مشہور کر دیا گیا ہے۔ بہر حال اس کے پیچھے کسی نہ کسی چالاک شخص کا ذہن کام کر رہا ہے۔ اور ایسے لوگ سماج اور سوسائٹی کے لئے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

آم کا نام بدلتے ہوئے انسانوں کے نام بدل دیتے ہیں ۔ اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا ہوا ۔
خدا بچائے ان سے ۔

تو کھائیے، یہ آم ہے بگین پلی کا —!

یہ حیدر آباد کا —!

یہ دلّی کا —!

یہ لکھنؤ کا —!

یہ بمبئی کا —!

شہر شہر گاؤں گاؤں جانے کی ضرورت نہیں ۔ یہاں ہر شہر اور ہر گاؤں کا مال رکھا ہے، طلب کیجیے، کوئی بھی دکان والا آپ کی خدمت میں اسے پیش کر دے گا ۔

آم کھانا اور کھلانا اس ملک کی ایک شریفانہ روایت ہے اور آج بھی یہ روایت ہزارہا سال سے چل رہی ہے ۔

غیروں سے تعلقات بڑھانے کے لئے آم کے تحفے بھیجے جاتے ہیں ۔ آم پارٹیوں میں کھانے کا میوہ نہیں ہے ۔ اور نہ ڈرائنگ روم میں استعمال کرنے کا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف بڈ روم کے لئے پیدا کیا ہے ۔ اور جو چیز جس مقصد کے لئے پیدا کی جاتی ہے ۔ اس کا وہیں استعمال ہونا چاہئے ۔

اسی لئے بڈ روم سے باہر پارٹیوں میں یا ڈرائنگ روم میں لوگ اس کی ایک دو قاشیں زبان پر رکھ کر بس بس کہنے لگتے ہیں ۔ حالاں کہ ان کا جی تو چاہتا ہے کہ پلیٹ میں جتنے آم رکھے ہیں، وہ سب کے سب چٹ کر جائیں ۔ لیکن آم سے ہاتھ گندے ہو جاتے ہیں اور بعض وقت اس کا رس اُچھل کر فوارے کی طرح کپڑوں پر آ گرتا ہے ۔ اس سے کون بچائے؟ ویسے بے تکلف دوستوں کی محفل میں یہ سب چلتا ہے ۔

آم بالکلیہ عوام کا میوہ ہے۔ خواص کبھی کبھی تفریحاً اسے استعمال کر لیتے ہیں۔ جب تک آم کا موسم رہتا ہے عوام کبھی چاول، گیہوں یا اناج کی کسی قسم کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بس دن رات آم ہی کھاتے رہتے ہیں۔

آم ہندوستان کا وہ واحد میوہ ہے جو ہر چالیس قدم پر مفت دستیاب ہوتا ہے۔ ہر دس گھروں میں ایک گھر ایسا ہوگا جس کی انگنائی میں آم کے ایک دو پیڑ ضرور کھڑے ہوں گے، یا آبادی سے ایک میل آگے نکل جائیے، ہر سمت میں امرائی ہی امرائی ہوگی۔ اور امرائی وہ مقام ہوتا ہے جہاں آم کے سینکڑوں پیڑ نیلے آسمان کے نیچے کھڑے اپنے چاہنے والوں کے منتظر ہوں گے۔

اس لئے تھوڑی سی زحمت کیجیے، امرائی میں جائیے اور اپنی پسند کا پھل توڑ لیجیے پھل توڑنا بری بات نہیں اور نہ یہ کسی ملک کی اخلاقیات کے کوڈ بل کے خلاف ہے۔ پھل ہوتا اسی لئے ہے کہ کھایا جائے۔ البتہ براہ راست درخت سے توڑ کر کھانے والے اصل میں وہ ذہین اور سمجھ دار لوگ ہوتے ہیں جو خداوند قادر کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں۔

ورنہ دنیوی قانون کے ڈر سے جو پھل نہیں توڑتا وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ ایسے شخص کو عام زبان میں بزدل کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھل کوئی دوسرا توڑ لیتا ہے۔ اور یہ منہ دیکھتے ہوئے رہ جاتا ہے، یا پھر گٹھلیاں گننے لگتا ہے۔ جو حضرات گٹھلیاں گننے کی مشق کرتے ہیں، وہ آم نہیں کھاتے۔ اور جو آم کھاتے ہیں وہ گٹھلیاں نہیں گنتے۔ یوں بھی مقدس کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ اے آدم زاد تو خلیفۃ فی الارض ہے۔ اس زمین پر اگنے والی ہر شئے تیرے استعمال کے لئے پیدا کی گئی، اور تو اس سے غافل ہے۔ افسوس صد افسوس تھو ہے تیرے منہ پر ـــ!

اگر گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو تو آم کھائیے ۔ اور خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے ۔

اگر اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے تو بھی آپ کو آم کھانا چاہیئے ۔ ورنہ قدرت کو یہ بات پسند نہیں آئے گی ۔ اور اسے ناشکری سمجھا جائے گا ۔

یوں بھی آم کھانے اور کھلانے میں بہت سے فائدے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ خلوص بڑھتا ہے اور دوسرا یہ کہ جسمانی صحت ٹھیک رہتی ہے ۔ تیسری بات یہ کہ جیب کی صحت بھی اچھی ہو جاتی ہے ۔ آم جسمانی صحت اور جیب کی صحت کے بیچ میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے ۔

ویسے آم کھلانے کی کوئی خاص تکنک نہیں ہوتی ، البتہ کھانے کی تکنک ہوتی ہے ۔ اور وہ بھی ایک نہیں کئی تکنکیں ہیں اس کی ۔ بشرطیکہ آدمی سمجھ دار ہو ۔

حیدر آباد کے ایک حضور پرنور کی مثال سامنے ہے ۔ وہ بڑے سلیقے سے ایک آم کے عوض دس پندرہ ہزار روپے بڑی آسانی سے حاصل کر لیتے تھے ۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے ۔ دو پیسے میں انڈا بکتا تھا اور مرغی کی قیمت چار آنے تھی لیکن اس پر بھی لوگ بھاؤ تاؤ کرتے تھے ۔ غور فرمائیے اس وقت اتنی بڑی رقم لوگوں کی جیب سے نکلوالینا کوئی معمولی بات نہیں تھی ۔

حضور پرنور حکیم السیاست تھے اور یوں کرتے تھے کہ ایک ملغوبہ قسم کا بڑا آم کٹواتے تھے اور اس کی پندرہ یا بیس یا جتنی قاشیں نکلتی تھیں انھیں اپنے جاں نثاروں کے یہاں ایک ایک پلیٹ میں ایک ایک قاش رکھ کر بھیج دیتے تھے ۔ پھر کیا ہوتا ۔ شہر میں دھوم مچ جاتی اور سب کو اطلاع ہو جاتی تھی کہ سرکار نے اپنے غلام ابن غلام کو نوازا ہے ۔

غلام ابن غلام کی زندگی میں وہ لمحہ بڑا ہی اہم اور اکسائٹنگ ہوتا جب حضور پرنور کے باوردی سپاہی اس کے گھر پر ایک بڑے سے خوان میں رکھی ہوئی پلیٹ میں وہ

اکلوتی قاش دے آتے۔

اگر غلام مسلمان ہوتا تو شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھتا، ہندو ہوتا تو مندر جا کر گھنٹہ بجاتا یا پھر جس مذہب کا ہوتا اس انداز میں اپنے خدا کا شکر ادا کرتا کہ اس کی مہربانی اور فضل سے آخر حضور کی نظر اس پر پڑ ہی گئی!

پھر وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس قاش کو چکھتا۔

دوسرے دن وہ بگلس لگا کر حضور پر نور کے دربار میں پہنچتا اور جھک کر حسب قاعدہ پانچ یا سات فرشی سلام بجالاتا۔

حضور پر نور مسکرا کر ارشاد فرماتے، کیسا تھا ہمارا بھیجا ہوا آم؟

اتنا سنتے ہی غلام سات فرشی سلام اور بجالاتا، اور دست بستہ عرض کرتا کہ خداوند نعمت! غلام اور اس کے اہل و عیال نے آج تک اتنا میٹھا اور عمدہ آم نہیں کھایا۔ تادم زیست اس کا ذائقہ یاد رہے گا۔

حضور پر نور جواب سے بے حد خوش ہوتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے رانوں پر مارکر کہتے سچ کہا، حق کہا۔

پھر غلام حسب حیثیت حضور کی خدمت میں اشرفیاں پیش کرتا۔ اشرفیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ کچھ بھی ہو سکتی تھی لیکن کم سے کم دو ہونی چاہیئے تھی۔ اور یہ ایک روایت تھی جو حضور کے خاندان غلاماں میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔

حوالے کے لئے قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ جدید تاریخ میں دروغ گوئی بہت آ گئی ہے۔ اس لئے ناموں کے علاوہ ہر شے بدل گئی ہے۔ لیکن پرانی تاریخ میں کہیں کہیں صرف ناموں کی گڑبڑ ہے۔ ورنہ واقعات حرف بہ حرف صحیح ہیں۔ یاد رکھئے یہ خاندان غلاماں وہی ہے جو بعد میں ہندوستان کے تخت پر رونق افروز ہوا۔

ہندوستانی تاریخ کا سنہرا باب۔

آقا اور غلام دونوں ایک ہی تخت پر بیٹھ گئے۔ اللہ اللہ کیا محبت تھی اور کیا خلوص تھا کہ آقا نے غلام کو پاس بٹھا لیا۔ اور سچ پوچھیے تو ان کو ملانے والا آم تھا۔

ایک آم اور کئی اشرفیاں ۔۔۔!

کئی اشرفیاں اور ایک آم ۔۔۔!!

حضور پُرنور کی خدمت میں اشرفی پیش کرنے کے اس عمل کو نذرانہ کہا جاتا تھا۔ لیکن بعض تنگ نظر اور تنگ دل حضرات نے اسے رشوت کا نام دیا ہے، لعنت ہے ان پر۔ خدا غارت کرے انھیں!

جب تک حضور کا دم خم تھا کیا مجال کہ کوئی ان کی طرف نظر بھی اُٹھا لیتا۔ انگلی اٹھانا تو بڑی بات ہے۔ لیکن جب سے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اپنی اپنی زبان اور انداز میں بڑبڑا رہا ہے۔

حالانکہ جمہوریت میں بھی نذرانے کی رسم بڑی زوروں پر چل رہی ہے۔ بغیر نذرانے کے کوئی چپراسی بھی فائل ایک میز سے اٹھا کر دوسری میز پر نہیں رکھتا۔ کلرک اور افسر تو بڑی بات ہے۔ حضور پرنور خواہ مخواہ بدنام تھے۔

لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہ سب حضور پرنور کا صدقہ ہے کہ انھوں نے جاگیردارانہ سماج کو نذرانے کی رسم عطا کی۔ اور آم کا تحفہ دیا۔

آم کا جاگیردارانہ تہذیب سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور سچ پوچھیے تو اس تہذیب نے آم کو آم باقی رکھا۔ اور آم کو باقی رکھنے میں جو نمایاں رول انجام دیا اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ اور انشاءاللہ مستقبل میں بھی ملنے کی کوئی امید نہیں۔

آم کی پیداوارانہ قوتوں کو اس تہذیب نے بڑھا وا دیا۔ آم کے سینکڑوں اور

لاکھوں پیڑ اور باغ اس سچائی کے خاموش گواہ ہیں۔
قسم قسم کے آموں کے انھوں نے قسم قسم کے نام بھی رکھے۔
بھئی جواب نہیں تھا ان سب کا۔ واہ واہ کیا نام رکھا ہے۔
دل پسند
بے نشاں
ملغوبہ
حمایت
جہانگیر
شاہجہاں
اور — اور عورتیں تو اس نام سے ڈر جاتی ہیں۔ باپ رے باپ — کالا پہاڑ — !
مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی شیطان اور بھوت کا نام تھوڑی ہے
جو ان بے چاریوں کو ہڑپ کر لے۔
البتہ اس نام پر تو وہ مسکراتی ہیں۔ ان میں سے ایک آہستہ سے کہتی ہے — لنگڑا۔
لنگڑا تو آم کا نام ہے۔ لیکن ان میں چھیڑ چلتی ہے اور ایک دوسرے کو کہنی مار
کر، آنکھ مار کر کہتی ہے، ہے، لنگڑا ہے تو کیا ہوا — مگر ہے مزے کا۔
پھر وہ زبان سے چٹخارہ لیتی ہوئی اپنی سہیلی سے کہتی ہے، لے تو بھی دیکھ نا اِس
لنگڑے کو — !
سہیلی اس کی کمر میں چٹکی لیتی ہوئی کہتی ہے، نا بابا نا — یہ لنگڑا لولا تجھے ہی مبارک
میں تو کالے پہاڑ سے نمٹ لوں گی۔

قلمی آم اصل میں اسی تہذیب کی دین ہے۔

قلمی آم اور دوسرے آموں میں صرف ایک فرق ہوتا ہے۔ غیر قلمی آم بیج سے پیدا ہوتا ہے اور بیج سے پیڑ بننے تک اس پر سے دس موسم گزر جاتے ہیں، پھر اس کے بعد پھل آتا ہے۔

لیکن قلمی آم کا درخت ایک سال میں ہی اپنا سر اُٹھاتا ہے۔ یہ دو درختوں کی ٹہنیاں کو ایک ساتھ ملا کر زمین میں بو دیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کو "کراس بریڈ" کہتے ہیں۔ سال گزرنے کے بعد جب پھول آتا ہے تو اسے فوراً توڑ دیا جاتا ہے — کیونکہ وقت سے پہلے کی بلوغت میں ہمیشہ کچا پن ہوتا ہے۔ اور اولاد غیر صحت مند پیدا ہوتی ہے۔ اور لوگ اسے دیکھتے ہی کہہ دیتے ہیں، دوغلا آم — دوغلا آم —!

اس آم میں دونوں پیڑوں کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اگر دونوں پیڑ کے پھل میٹھے ہوں تو کیا کہنے۔ ورنہ دوغلا آم کھٹاس اور مٹھاس کی آمیزش کا ایک نایاب نمونہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے شوق سے کھاتے ہیں کیونکہ اس ایک آم میں دو آموں کا مزہ چھپا رہتا ہے۔

چھٹپن سے بعض لوگ میٹھا رغبت سے کھاتے ہیں اور بعض کا رجحان کھٹے کی طرف ہوتا ہے۔ اس میں مرد اور عورتوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ لیکن میٹھا کھانے والی عورتیں اگر میٹھے کو چھوڑ کر اچانک کھٹی چیزیں کھانے لگیں اور کھٹا کھانے والی خواتین میٹھے کی طرف اپنی رغبت کا اظہار کریں تو یقیناً ذات کے کرب کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ان خواتین کو کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے جو چھپے چھپے کیری کھاتی ہیں اور انھیں کسی ماہرِ نفسیات سے جو کیری کھانے کی عمر میں رس گلے کا استعمال فرماتی ہیں۔

کب تک چھپے گی کیری پتوں کی آڑ میں!

مشہور کہاوت ہے جو ایک خاموش راز کی طرح صدیوں سے اپنا سفر طے کرتی ہوئی

آئی ہے۔ سینہ بہ سینہ۔

لیکن اس کھلے جھوٹ کو ہم سب قبول کر لیتے ہیں۔ کیری تو اپنے سبز رنگ سے فائدہ اٹھا کر پتّوں کی آڑ میں خود کو بہر حال چھپا لیتی ہے۔ لیکن پکے ہوئے آموں کا للچائی ہوئی نظروں سے چھپانا بہت ہی مشکل ہے۔

شریف سا شریف آدمی بھی گزرتے ہوئے ان پر ایک بُری اور للچائی ہوئی نظر ڈال ہی لیتا ہے۔

ہرے ہرے پتّوں سے جھانکتے ہوئے پیلے پیلے پکے ہوئے آم —!

لال لال اور رس سے اُبلتے ہوئے آم —!

آم جن کے درجنوں نام ہیں —!

اور جن کی کئی قسمیں ہیں —!

لیکن ایماندارانہ بات یہ ہے کہ آم کی کوئی قسم وسم نہیں ہوتی۔ آم آم ہوتا ہے۔ میٹھا یا کھٹا۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر اس کی تقسیم ضروری ہی ہے تو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے —

(۱) رسل

(۲) غیر رسل

رسل وہ آم ہوتا ہے جسے چوس کر کھایا جاتا ہے۔

غیر رسل وہ ہوتا ہے جسے چھری کانٹے کی مدد سے استعمال کیا جاتا ہے۔

ویسے اس کی کوئی پابندی نہیں کرتا، جس کے جی میں جو آئے وہ کرتا ہے بشرطیکہ آم بڈروم میں کھائے جا رہے ہوں۔

ورنہ عام طور پر سب کے سامنے اخلاق اور تہذیب کی مروجہ قدروں کو اپنانے کی ممکنہ کوشش کی جاتی ہے۔

جو لوگ چوسنے والے آم پسند کرتے ہیں وہ کاٹ کر کھانے والے آموں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ اور جو آم کو کاٹ کر کھانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں وہ چوسنے والے آموں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ اور بعض لوگ انٹرنیشنل قسم کے واقع ہوتے ہیں یعنی یہ کہ اِدھر بھی ہوتے ہیں اور اُدھر بھی، اس میں جنس کی کوئی قید نہیں ہے، عورتیں اور مرد اس ہابی میں برابر کے شریک ہیں۔ لیکن آم چوسنے کی تکنک کو عورتوں نے جو حُسن عطا کیا ہے اس کے مقابلے میں مرد صفر ہیں۔ وہ لمحہ بڑا حسین ہوتا ہے جب کوئی اونچی پوری حسین عورت دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر چُسر چُسر آم چوسنے لگتی ہے اور دیکھنے والے حیرت سے اپنا مونہہ کھول دیتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ وقت ٹھہر جائے اور منظر کبھی نہ بدلے۔

آم چوسنا ایک آرٹ ہے۔ ہمارے ملک نے دنیا کو اس آرٹ سے واقف کرایا لیکن اب یورپی ممالک کی خواتین یہاں کی عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ گئی ہیں شاگرد اگر ذہین ہو تو استاد کا یہی حشر ہوتا ہے:

آم نے غیر ترقی یافتہ ممالک کو ترقی یافتہ اور ترقی یافتہ ممالک کو اور زیادہ ترقی یافتہ بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ آم محبت، پیار، امن اور دوستی کا سمبل ہے۔ اس لئے اس سمبل کو خریدنے اور بیچنے کی اصطلاحوں میں نہیں سوچنا چاہئے۔ البتہ حضور پرنور کے مبارک نقشِ قدم چل کر آپ کا صحیح انداز میں استعمال کرنا چاہئے۔

جاگیردارانہ تہذیب کے علاوہ آم کا اُردو تہذیب سے گہرا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو بولنے والا بچہ سب سے پہلے جب اُردو پڑھتا ہے تو اُس کا پہلا سبق آم سے شروع ہوتا ہے۔

اور وہ بھی اس طرح :—

آم لا

لالا آم لا

لالا دو آم لا

لالا لا۔ آم لا

دو آم لا ۔۔!!

سوالات:۔

(۱) لالا کو دو آم لانے کے لئے کیوں کہا گیا؟ تین کیوں نہیں؟ تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

(۲) قاش کی تعریف کیجئے۔ اور بتائیے کہ حضور پرنور کی خدمت میں ایک قاش کے عوض کتنی اشرفیاں پیش کی جاتی تھیں؟

(۳) ان عورتوں کی نفسیات پر روشنی ڈالئے جو آم چوس کر کھاتی ہیں۔

(۴) ذیل میں سے کسی دو پر مختصراً نوٹ لکھئے:۔

(i) بیگن پلی کا آم (ii) لنگڑا (iii) کالا پہاڑ

نوٹ:۔ خوش خطی کے پانچ نمبر محفوظ ہیں۔
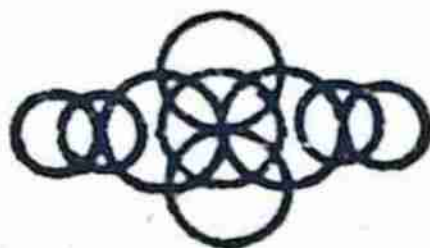
بھینس

دیکھنا وہ سامنے بھینس کھڑی جگالی کر رہی ہے!

آہا! کیسا کالا! دمکتا ہوا رنگ ہے. طبیعت کی بے حد خاموش اور بے ضرر ہے. قریب سے گزر جایئے کچھ نہیں کہے گی. اور نہ پلٹ کر دیکھے گی. اس کے سر پر اُگی ہوئی ٹیڑھی میڑھی سینگیں صرف دیکھنے کی چیز ہیں. آج تک اس نے اپنی سینگوں سے کسی کو مارا نہیں. بچے بھی اس سے مذاق کرتے ہیں. لیکن وہ بُرا نہیں مانتی. بلکہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی ہے. اسے معلوم ہے کہ اس کا وجود دوسروں کے لئے سامانِ تفریح ہے اس لئے وہ بھی خوشی خوشی اس تفریح میں شریک ہو جاتی ہے. اگر کوئی اپنا مذاق اُڑانے لگے تو دوسروں کو موقع ہی کہاں. ہتا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہے.

بھینس جب بھی کسی گلی کوچے اور سڑک سے گزرتی ہے تو لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے اور جب اپنے گھر یا کسی گھر کے دروازے

میں قدم رکھتی ہے تو اللہ کی پناہ ۔ لوگوں کا ہنسی روکنا مشکل ہوجاتا ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی شئے خالی نہیں رہی ۔

بھینس کو اس کا اندازہ ہے' اس لئے وہ دوسروں کو ہنسانے کے لئے اور ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہے ۔ اور اس بے نیازانہ انداز میں یوں آگے بڑھ جاتی ہے جیسے اسے کوئی دیکھ ہی نہیں رہا ہے ۔ البتہ جب وہ جگالی کے موڈ میں ہوتی ہے تو وہ بھینس نہیں رہتی بلکہ کچھ اور ہوجاتی ہے ۔

جگالی بھینس کی ہابی ہے ۔ اور جب کوئی بھینس اس ہابی میں نمہک ہوجاتی ہے تو وہ دنیا دما فیہا سے بے خبر ہوجاتی ہے ۔ اور زمین سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں سے بلند ہو کر نہ جانے کن کن آسمانوں کی سیر کرنے لگتی ہے ۔

ویسے کوئی بھینس خواب نہیں دیکھتی ۔ لیکن آج کے سماج کا قریب قریب ہر شخص بھینس کے خواب دیکھتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ کہیں سے بھی اور کسی طرح بھی کوئی بھینس اس کے سونے آنگن میں چلی آئے ۔ اور ــ اور گھر میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں ۔

اور پھر دودھ کی نہر کو پانی کے میٹھے تالاب کی طرف موڑ دینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا ۔ پہلے دودھ میں پانی ملایا جاتا تھا لیکن آج کل پانی میں دودھ ملایا جاتا ہے ۔ بزنس کا بزنس اور سارا مکھن اپنا ۔

بھینس سوفی صد مفید جانور ہے ۔ یہ صرف دودھ ہی نہیں دیتی بلکہ اس کے گوبر سے کئی گیاس پلانٹ چلتے ہیں ۔ اور لاکھوں گھروں میں چولھے جلتے ہیں ۔ اور چولھا نہ جلے تو روٹی کیسے پکے ۔

مرنے کے بعد بھی یہ فائدہ پہنچاتی ہے ۔ اس کے چمڑے سے جوتے اور بیاگس بنتے ہیں اور سینگوں سے کنگھیاں !

بھینسوں کی کوئی قسم نہیں ہوتی ۔ اچھی بھینس وہی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ دودھ دے ۔ اور کم کھائے ۔ بلکہ کھائے ہی نہیں اور برابر دودھ دیتی رہے ۔ روسی اور امریکی بھینسوں کا جواب نہیں ہوتا ۔ جی چاہا تو دودھ کے چشمے بہادیں گی اور موڈ آف ہوجائے تو سینگیں مار مار کر دودھ نچوڑنے والے کو ختم ہی کردیں گی ۔

ہمارے ملک کی بھینسیں ابھی اتنی اڈوانس نہیں ہوئی ہیں ۔ اس لئے اپنی سینگوں کا کبھی استعمال نہیں کرتیں ۔ البتہ کبھی کبھی دودھ دھونے والے کو لات ماردیتی ہیں ۔ اور وہ خوشی خوشی اس لات کو قبول کرلیتا ہے ۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دودھ دینے والی یا پلانے والی کو اس بات کا قانونی اور اخلاقی حق پہنچتا ہے کہ لات مارے ۔ اور سچ پوچھئے تو اس لات میں برکت بھی ہوتی ہے ۔

پنجابی بھینس دنیا کی کسی بھی بھینس کا مقابلہ کرسکتی ہے ۔ مقابلہ کیا یہ سب سے آگے ہے ۔ اتنی اونچی پوری اور شاندار ہوتی ہے کہ نظریں ٹک کر رہ جاتی ہیں ۔ پیٹھ اتنی چکنی ہوتی ہے کہ ہاتھ پھیرنے کو جی چاہتا ہے ۔ یہ لات بھی نہیں مارتی ، کبھی کبھی سینگ بھی ماردیتی ہے ۔ اس لئے اس کی مرضی اور پسند کا ہر ایک خیال رکھتا ہے ۔

ویسے پہلے زمانے میں بھینس پالنا بے وقوفی کی ایک علامت سمجھا جاتا تھا ۔ اور عقل مند آدمی اسے کہا جاتا تھا جو بھینس نہیں پالتا تھا بلکہ دوسروں کی بھینسوں سے استفادہ کرتا تھا ۔ اور آج صورتِ حال مختلف ہے ۔

یہ دوسری بات ہے کہ پہلے بوڑھے بھینسوں کو پالتے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے ۔ لیکن آج کل بوڑھے بکریوں کو پال رہے ہیں ۔ اور نوجوان بھینسوں کے پیچھے ہیں جس کو دیکھو وہ کسی نہ کسی بھینس کی تلاش میں ہے ۔ سنا ہے کہ جتنی موٹی بھینس ہوگی وہ اتنا ہی زیادہ دودھ دے گی ۔ اور جس کے حصہ میں بھینس آئے گی

یا جو بھینس کا مالک بن جائے گا وہ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کا بڑا آدمی بن جائے گا۔
لکھ پتی ـــ کروڑ پتی ـــ آسمان سے باتیں کرتا ہوا بنگلہ۔

دست بستہ کھڑے ہوئے خادم!

اور دنیا اس کے مقدس قدموں میں!!

ڈشتم ـــ ڈشتم ـــ!!

بنگلہ بنے نیارا ـــ!

ترقی اسے کہتے ہیں۔

میرے دوست مسٹر عبداللطیف آرٹسٹ نے محمد خاں کی مثال دیتے ہوئے مجھے شرم دلائی، اور کہا کہ تم کہاں ہو؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور ابھی تک تم سڑکوں پر پیدل گھوم رہے ہو، لعنت ہے تم پر اور تمہاری اس گونگی شرافت پر۔

"خاں!" میں نے حیرت سے آنکھیں ملتے ہوئے اور منہ کھولتے ہوئے پوچھا کہ "آخر محمد خاں راتوں رات کیسے لکھ پتی بن گیا۔ وہ ڈبل پاس محمد خاں انتہائی نالائق کاہل اور بے ایمان قسم کا آدمی تھا۔ کیا کوئی لاٹری اس کے نام آئی یا ریس میں اس کا کوئی گھوڑا آگے نکل گیا۔

عبداللطیف نے کہا، "کوئی گھوڑا ووڑا نہیں بلکہ محمد خاں کی دانشمندی کام آئی۔ اور اس کی سچی محبت نے اسے یہ مقام عطا کیا۔

واقعی حیرت کا مقام ہے۔ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا اور آخر کار اس کی ترقی کا قائل ہوگیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ محمد خاں کی چالیس سالہ بیوی وہ دودھ دیتی ہوئی بھینس ہے جس نے اپنے بھائی بہنوں اور خاندان ہی کو نہیں نوازا بلکہ جس پر بھی کرم کی ایک نظر ڈالی وہ نہال ہوگیا!

محمد خاں ہندوستان میں رہتا ہے' اور اس کی بیوی اس ملک میں رہتی ہے جہاں پٹرول پانی کی طرح بہتا ہے۔ اور پانی پٹرول کی قیمت پر بکتا ہے۔ اور کھجور کے درختوں کی چھدری چھاؤں میں کوئی مسافر ایک لمحہ کے لئے اپنی سانس کو درست کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

محمد خاں کی بیوی کسی سرکاری دواخانے میں ہیڈ نرس ہے۔ اور جو ہر ماہ ہزاروں روپیوں کا ڈرافٹ اپنے شوہر کو بھیجتی ہے۔ اور ہر اس رشتہ دار کو بھیجتی ہے جو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

اور مسٹر سیموئیل کی بیوی بھی وہ دودھ دیتی ہوئی بھینس ہے جس نے اپنے شوہر کو لوور ڈیویژن کلرک کی کرسی سے اٹھا کر سمنٹ فیکٹری کا مینجنگ ڈائرکٹر بنا دیا۔ کہاں ایک گھنٹی کی آواز پر فائیل ہاتھ میں لئے دوڑ کر آنے والا ایک حقیر سا کلرک۔۔ اور کہاں کمپنی کا مینجنگ ڈائرکٹر جس کی ایک گھنٹی پر بڑے بڑے افسر دوڑ کر آتے ہیں۔ معجزہ ہے معجزہ ــــ اور یہ معجزہ مسز پرمیلا سیموئیل کی وجہ سے ظہور میں آیا۔

لنچ کے ایک ٹیبل پر میرے ایک دوست نے میرا مسز پرمیلا سیموئیل سے تعارف کروایا۔ اور میں نے محسوس کیا' دنیا کا مظلوم ترین انسان مسٹر سیموئیل ہے۔

مسز پرمیلا سیموئیل صرف کالی اور موٹی ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن انھیں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسی جلی ہوئی روٹی ہیں جس کے جلنے کا کوئی اور مجبور نہیں۔

اس کے مقابلے میں مسٹر سموئیل اونچے پورے اور خوب صورت نوجوان ہیں۔

جب میں نے افسوس کا اظہار کیا تو ایک اور دوست نے مسز پرمیلا کی ایک اور خوب صورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' جانتے ہو مسز پرمیلا دو ۔ ی کی

لمیٹڈ فیکٹریوں کی شیر پارٹنر ہے۔ اور ان کا نیس فی صد سرمایہ وہاں کام کر رہا ہے اور جس کا مطلب ہے کہ ہر مہینہ لاکھوں روپیوں کا منافع ـــــ یار! اپنے دوست سیموئیل کے نصیب جاگ اُٹھے۔

اور مسٹر لبتہ والا تو پارسی تھا۔ اور خود شہر کے ایک بڑے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے بھی بھینس پالنے کا شوق چرایا۔ اور اس نے بھی اپنے آنگن میں ایک بھینس باندھ لی۔

بھینس کا کوئی مذہب، کوئی زبان اور کوئی وطن نہیں ہوتا۔ بھینس بھینس ہوتی ہے۔ بھینس کے رفیق حیات کو سانڈ کہتے ہیں۔ اور سانڈ صاحب بھی اپنی جیون ساتھی بھینس کی طرح کھلے دل اور کھلے دماغ کے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اور نہ کبھی ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں کو پوری پوری آزادی حاصل ہے کہ جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے رہ جائے۔ اگر ان میں سے کوئی کچھ کہہ دے تو اسے شخصی زندگی میں مداخلت سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی بات پر علیحدگی کی نوبت آتی ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

بھینس اور سانڈ میں بنیادی طور پر ایک ہی فرق ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بھینس تو دودھ دیتی ہے اور سانڈ دودھ نہیں دیتا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ اسے شوق سے پالتے ہیں۔ پہلے زمانے میں شرفاء اسے پالتے تھے اور اس کی خدمات صرف ڈیوڑھیوں اور کوٹھیوں کی حد تک محدود تھیں۔ لیکن جمہوریت میں اس کا حلقہ اثر بڑھ گیا ہے اور وہ اپنے گاؤں، شہر اور ملک کے لئے کام کرتا ہے۔ ایسے سانڈیں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور سانڈ ہوتا ہے جو آفاقی

ہوتا ہے اور جسے رنگ، نسل اور ملکی حدود میں محصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور جو پوری دنیا کی خدمت کرتا ہے، آج یہاں تو کل امریکہ میں، اور پرسوں روس اور چین کے دورے پر ـــ ویزا ـــ پاسپورٹ ـــ ایر فلائٹ ـــ ناشتہ یہاں تو لنچ لندن میں اور ڈنر پیرس میں۔ ڈشم! ڈشم!!

سانڈ کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اجتماعی مفادات کا خیال رکھتا ہے۔ اور سب کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ اور بھینس صرف دودھ دیتی ہے۔ اور بچے پیدا کرتی ہے۔ بھینس کے بچے کو پاڑا یا بچھڑا کہتے ہیں جو بڑا ہو کر سانڈ کہلاتا ہے اور اپنے محلے یا شہر کا نام روشن کرتا ہے۔

لیکن بھینس کی اہمیت اس سے کسی طرح کم نہیں ہوتی، بلکہ اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہی تو ہے جو سانڈ کو جنم دیتی ہے۔

ذرا دیکھنا! وہ سامنے فٹ پاتھ پر بس اسٹانڈ کے قریب کس شان سے بھینس کھڑی جگالی کر رہی ہے ـــ!
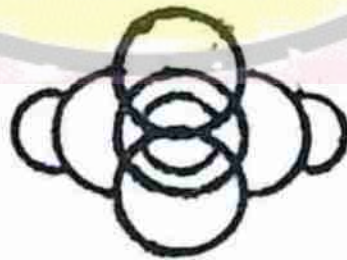
گوشت کی دکان

حضور اِدھر آیئے اِدھر!

یہاں پر ذبح کئے ہوئے بکرے کا حلال گوشت بکتا ہے۔ آپ خود بہ نفس نفیس ملاحظہ کیجئے۔ کیا عمدہ اور تروتازہ گوشت ہے۔ ابھی ابھی میں نے اسے ذبح کیا ہے۔ ویسے یہ بچہ تھا لیکن اس میں جوانوں سے بڑھ کر طاقت تھی۔۔ جسم پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کس کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ چت لٹا کر میں نے اسے پانی پلایا اور دل ہی دل میں بسم اللہ پڑھی اور تین بار بآوازِ بلند کہا' اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ حکم دیجئے کتنا تول دوں۔ ایک کلو، دو کلو۔ یا پوری ایک ران۔ یقین کیجئے ایک بھاپ پر گوشت گل کر مسکہ بن جائے گا۔ صرف ایک بھاپ پر۔ لوٹلہ ہے لوٹلہ۔

لیکن اس طرح آپ مجھے حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ شاید آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس محلّے میں نئے نئے آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں خود اپنا تعارف کرواتا ہوں۔ میں اس محلے کا ' شہر کا مشہور قصاب بڈن خاں ہوں۔ لیکن پتہ نہیں لوگ کیوں مجھے دارا مسیح کے نام سے پکارتے ہیں۔ حالانکہ اس کے چہرے اور میرے چہرے میں کوئی مشابہت نہیں۔ اور نہ پیشے میں۔ ویسے بھی مجھے اس تقابل سے کوفت ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں کہ کوئی میرے چہرے پر جلاد جیسی تحریر پڑھے۔ بھلا میں کہاں اور جلاد کہاں! جلاد تو ایک معمولی اور حقیر سی شئے کا نام ہے۔ جو کسی کے حکم پر اپنا چھرا چلاتا ہے۔ اور میں ـــ میں تو اس سے بلند ہوں۔ میرے اندر سینکڑوں جلاد سو رہے ہیں۔ میں تو قصائی ہوں قصائی جو روز مسکراتے ہوئے اپنا تیز دھار والا چھرا چلاتا ہے۔ اور کسی بھی جانور کو ذبح کرتے ہوئے جس کے ہاتھ کبھی نہیں کانپتے۔

اللہ اکبر ـــ اللہ اکبر!

کیا شان ہے میرے مالک کی۔ کیا قوت دی ہے میرے مولا نے ان بازوؤں میں!

تو حضور میں عرض کر رہا تھا کہ یہ پوٹلہ ہے اور یہ کڑگہ۔ پوٹلے اور کڑگے میں وہی فرق ہوتا ہے جو سولہ سال کے لڑکے اور تیس سال کے جوان میں ہوتا ہے۔ ان دونوں کی وہی پہچان ہے جس سے آپ واقف ہیں۔ لیکن عمر کے اس فرق کو سمجھنا اور کون سا گوشت کس کا ہے یہ پہچاننا ایک مشکل کام ہے۔ یہاں آپ کو قصائی کے بیان پر بھروسہ کرنا ہوگا لیکن اکثر قصائی جھوٹ بولتے ہیں۔ اور اپنے گاہک کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ہزار میں ایک ملے گا۔ جو سچی بات کہے گا، میری طرح۔ ورنہ آپ کو پوٹلہ کا یقین دلا کر چھیلی کا گوشت دے دے گا اور آپ جانتے ہیں چھیلی' بکرے کی مادہ ہوتی ہے۔ اور عورت ذات پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بس پکنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کی ایک بوٹی نہیں گلی۔

میں عورت ذات کے کبھی پیچھے نہیں بھاگتا اور نہ اسے ہاتھ لگا کر بدنامی کے

گڑھے میں گرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں بازار میں میری ساکھ ہے۔ اور کون بیوقوف ہوگا جو اپنی ساکھ کو متاثر کرے۔ اس لئے میں ہمیشہ پٹھے ذبح کرتا ہوں۔ اس لئے آنکھ بند کر کے چلے آئیے۔ اور اپنی مرضی دلپسند کا گوشت حاصل کیجئے۔

بعض حضرات بغل کا گوشت پسند کرتے ہیں۔ بعض سینے کا۔ اور بعض صرف ران کے عاشق ہوتے ہیں۔ کلیجی، گردے، آنکھ، زبان، دماغ اور دل کے خواہشمند اور ضرورت مند حضرات سے میں ہمیشہ گزارش کرتا ہوں کہ صبح صبح آئیں، ورنہ انھیں مایوسی ہوگی۔ لیکن اس تعلق سے میں ایک بات آپ کے سامنے رکھ دوں کہ میں ضرورت مندوں کی ضرورت پہلے پوری کرتا ہوں جو کسی حکیم یا ڈاکٹر کی ہدایت پر میرے پاس دوڑے دوڑے چلے آتے ہیں۔ ورنہ وہ حضرات جو ان چیزوں کو تفریحاً کھاتے ہیں ان سے میری ادباً درخواست ہے کہ وہ پھر کبھی زحمت کریں۔

میری دکان کی ہڈیاں شہر بھر میں مشہور ہیں۔ اگر کوئی بوڑھا چالیس دن پابندی کے ساتھ ان ہڈیوں کا شوربہ پیئے تو وہ بوڑھا نہ رہے گا بلکہ جوانوں کی طرح ڈشم ڈشم کرنے لگے گا۔ میں حکیم تو نہیں لیکن یہ ہڈیاں اکثر امراض کا شرطیہ علاج ہیں۔

اونٹ کا گوشت سال میں صرف ایک بار بیچتا ہوں۔ اور مقامی اخبارات میں اس تعلق سے اشتہار بھی دیتا ہوں۔ اونٹ کا گوشت کھانا سنت ہے اور اس کا بیچنا ثواب۔ اس کے کھانے سے کئی فائدے ہیں۔ ایک نمایاں اور فوری فائدہ یہ ہے کہ بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ اور جوان ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ اور بوڑھا ـــ آپ خود کسی بوڑھے سے پوچھ لیجئے۔ میں کیا بتاؤں۔ شرم آتی ہے مجھے!

شکریہ! آپ نے پوری توجہ سے میری باتیں سُنیں۔ لیکن آپ اس طرح حیرت سے مجھے اور اس لٹکتی ہوئی ران کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں گرم گوشت کے نام پر ٹھنڈا گوشت بیچ رہا ہوں۔ حضور دل سے یہ بُرا خیال نکال دیجئے میں مر جاؤں گا لیکن کسی کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ بے شک بعض گاہک ٹھنڈا گوشت پسند کرتے ہیں۔ اور خوشی خوشی اسے لے جاتے ہیں۔ لیکن ٹھنڈا گوشت پسند کرنے والے کو گرم اور گرم پسند کرنے والے کو میں کبھی ٹھنڈا گوشت نہیں دیتا۔ آپ کا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ گرم آدمی ہیں۔ اس لئے گرم گرم گوشت پسند کریں گے۔ ٹھنڈا گوشت لے جانے والوں کی نفسیات ہی اور ہوتی ہے۔ وہ اپنی چال ڈھال لب ولہجہ اور انداز کے بڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ چھچھڑے بھی مار کر دے دیجئے تو کچھ نہیں بولیں گے۔ اور خاموشی سے پیسے دے کر اور سر جھکا کر چلے جائیں گے۔ گاہک گرم ہو تو دکان پر بھی گرمی رہتی ہے۔ ورنہ ٹھنڈ میں کاروبار چلنے سے رہا۔

میں آپ سے آپ کا نام نہیں پوچھوں گا۔ کیونکہ گاہک کا ایک نام نہیں، کئی نام ہوتے ہیں۔ اور تاجر کا ایک نام ہوتا ہے۔ اور اچھا تاجر وہ ہوتا ہے جو اپنی دکان پر آنے والے تمام گاہکوں کے احساسات، جذبات اور مذہبی اعتقادات کا احترام کرے۔ اس لئے میں کبھی گائے کو ذبح نہیں کرتا۔ اور نہ بُرے جانور کا گوشت بیچتا ہوں۔ بُرے جانور کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ کیونکہ ہندو اور مسلم دونوں میرے گاہک ہیں۔ اور دونوں میرے بھائی ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ کسی بھائی کی دل شکنی ہو۔

اگر آپ کا ان دونوں فرقوں سے کوئی تعلق نہیں تو کوئی بات نہیں۔ آپ بھی میرے لئے اتنے ہی قابلِ احترام ہیں جتنے یہ، یا دوسرے۔ اور ایک گاہک ہونے کے ناطے آپ کی

جائز ضرورت کو پوری کرنا میرا فرض ہے۔ فرمائیے ــ اور بغیر کسی جھجک اور تکلف کے کہیے کہ آپ کو کیا چاہیے۔

بیل کا اتنا نفیس گوشت آپ کو دوں گا کہ آپ عمر بھر اس کے ذائقہ کا لطف لیتے رہیں گے۔ اور دوسرے جانوروں کے گوشت کے مزہ کو بھول جائیں گے ــ اور ــ!

اور بُرے جانور کا گوشت ایسا دوں گا کہ آپ بار بار میری دکان پر تشریف لائیں گے۔

میں سچ کہتا ہوں، بُرے جانور کا یعنی سور کا گوشت کھانا اور بیچنا میرے مذہب میں حرام ہے۔ لیکن خدمت خلق کی خاطر میں اس گناہ کا بھی مرتکب ہوا ہوں اور ہو رہا ہوں۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں، ایک بار میں نے اس کے گوشت کا بھی ٹیسٹ کیا ہے ــ اللہ مجھے معاف کرے۔ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ کیا بتاؤں اب تک زبان پر ذائقہ ہے۔ یوں لگا جیسے کچا کھوپرا چبا رہا ہوں۔ واہ ــ واہ ــ اللہ نے بھی کیا چیز پیدا کی ہے جسے سور کہتے ہیں۔

بُرے جانور کے گوشت کے استعمال سے کئی فائدے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ کہ صحت اچھی ہو جاتی ہے اور آدمی کی شخصیت دن بہ دن ابھرنے لگتی ہے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں۔ مجھ ہی کو دیکھئیے میں اس کی زندہ مثال ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی المیے کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔ یوں سمجھئے کہ دل مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور آدمی بہادر۔ اہاہا ــ اہاہا!! لیکن یاد رکھئے آپ کو بُرے جانور کے گوشت کے لئے اصیل مرغ اور بیل کے گوشت کے لئے مرغی کا لفظ استعمال کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے بزنس کے کوڈ ورڈ ہیں۔

لیکن اس طرح آپ کب تک کھڑے رہیں گے۔ ذرا چین سے بیٹھ جائیں تو میں آپ کو ایک اہم اور راز کی بات بتاؤں۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ یہاں آدمی کا بھی

گوشت بکتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہمارے سماج میں ابھی بہت سے آدم خور ہیں جو منہ مانگے دام دے کر گوشت خریدتے ہیں۔

آپ بھی چند انسانی اعضاء کا نرخ سن لیجئے۔ زندگی میں شاید آپ کو یا آپکے کسی دوست کو ضرورت پڑے:

فی گردہ = پچاس ہزار روپے

دو گردوں کے = پچانوے ہزار (پانچ ہزار کی رعایت)

فی آنکھ = پچھتر ہزار

دو آنکھوں کے = سوالاکھ (پچیس ہزار کی رعایت)

انسانی ہڈیوں کا مکمل ڈھانچہ = دو ہزار روپے

(نوٹ) کم از کم چھ مہینے پہلے اپنا آرڈر بک کروانا ہوگا۔ اور پیشگی نصف رقم دینی ہوگی۔

۷۵ سی سی بلڈ گروپس کے مختلف بوتل ہم سے آدھی رات کو طلب کیجئے۔

فی بوتل = دو سو روپے

لیکن آپ کبھی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کریں کہ آخر انسانوں کا گوشت اور اعضاء ہمارے یہاں کہاں سے آتے ہیں۔ کہیں سے بھی آتے ہوں گے۔ آپ کو اس سے کیا مطلب ہے۔ آپ صرف اپنے کام کی حد تک کام رکھئے۔ مگر یہ برا خیال دل اور دماغ میں نہ آنے دیجئے کہ ہم آپ کی ضرورتوں کو قبرستانوں میں سونے والے مُردوں سے پورا کرتے ہیں۔ توبہ اور استغفار کیجئے۔ ہم بزنس میں کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم پیسے زیادہ لیتے ہیں لیکن مال نمبر وَن دیتے ہیں۔ یقین کیجئے یہ تمام اعضاء ہم زندہ انسانوں کے شکار سے حاصل کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آزما لیجئے۔ اور کہئے کہ آپ کو کس شخص کا گردہ یا دل چاہئے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ اگر کہیں آپ نے اپنی معصومیت اور بھولے پن سے اس راز کا انکشاف کیا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ آپ سالہا سال کے لئے اندر ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ آپ کو ایک اور راز کی بات سناؤں۔ وہ یہ کہ آپ کو یہ ظاہر ایک گوشت کی دکان نظر آرہی ہے۔ لیکن یقین کیجئے، اس کے اندر کئی گوشت کی دکانیں آباد ہیں چلتی پھرتی بولتی ہوئیں۔ لیکن یہ کاروبار میں دن میں نہیں کرتا۔ رات میں دس بجے کے بعد ایک دوسری ہی شان سے یہ دکان جگمگاتی ہے۔ آپ کا کبھی جی چاہے تو بلا تکلف یہاں تشریف لائیے۔ لیکن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی آپ کو یہاں سے لوٹ جانا پڑے گا۔

یہاں پر ہر ایک کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے اس لئے مختلف عمروں، رنگوں، نسلوں اور زبانوں کی چیز یہاں آپ کو ملے گی۔

ایک کملا، رادھا، بلقیس اور نورجہاں پر کیا منحصر ہے آپ کو درجنوں کملائیں اور نورجہائیں یہاں ملیں گی۔ پہلے آپ تشریف تو لائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔

میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بزنس بہت صاف کرتا ہوں۔ اگر آپ کو گوشت کی پرکھ ہے تو خود اندازہ کریں گے کہ میری باتوں میں کتنی صداقت ہے۔ یاد رکھئے زندگی کی سب سے بڑی اور آخری سچائی گوشت ہے اور وہ بھی گرم گرم، آگ کی طرح دہکتا ہوا ـــــ

تو حکم دیجئے۔ کتنا تول دوں۔ فکر مت کیجئے، میں ہمیشہ ذبح کئے ہوئے

بکرے کا حلال گوشت بیچتا ہوں۔

لیکن خدا کے لئے قیمے کا آرڈر مت دیجئے ورنہ مجھے حکم نہ ماننے کی گستاخی کرنی پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قیمے میں وقت اور آدمی کی محنت دونوں کی تباہی ہے اور میں اسے اپنے گاہک کے زورِ بازو پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود اپنی پسند کا قیمہ بنا لے۔

تو فرمائیے ۔۔۔ کتنا تول دوں۔

زیرِ طبع

راجندر سنگھ بیدی

کی
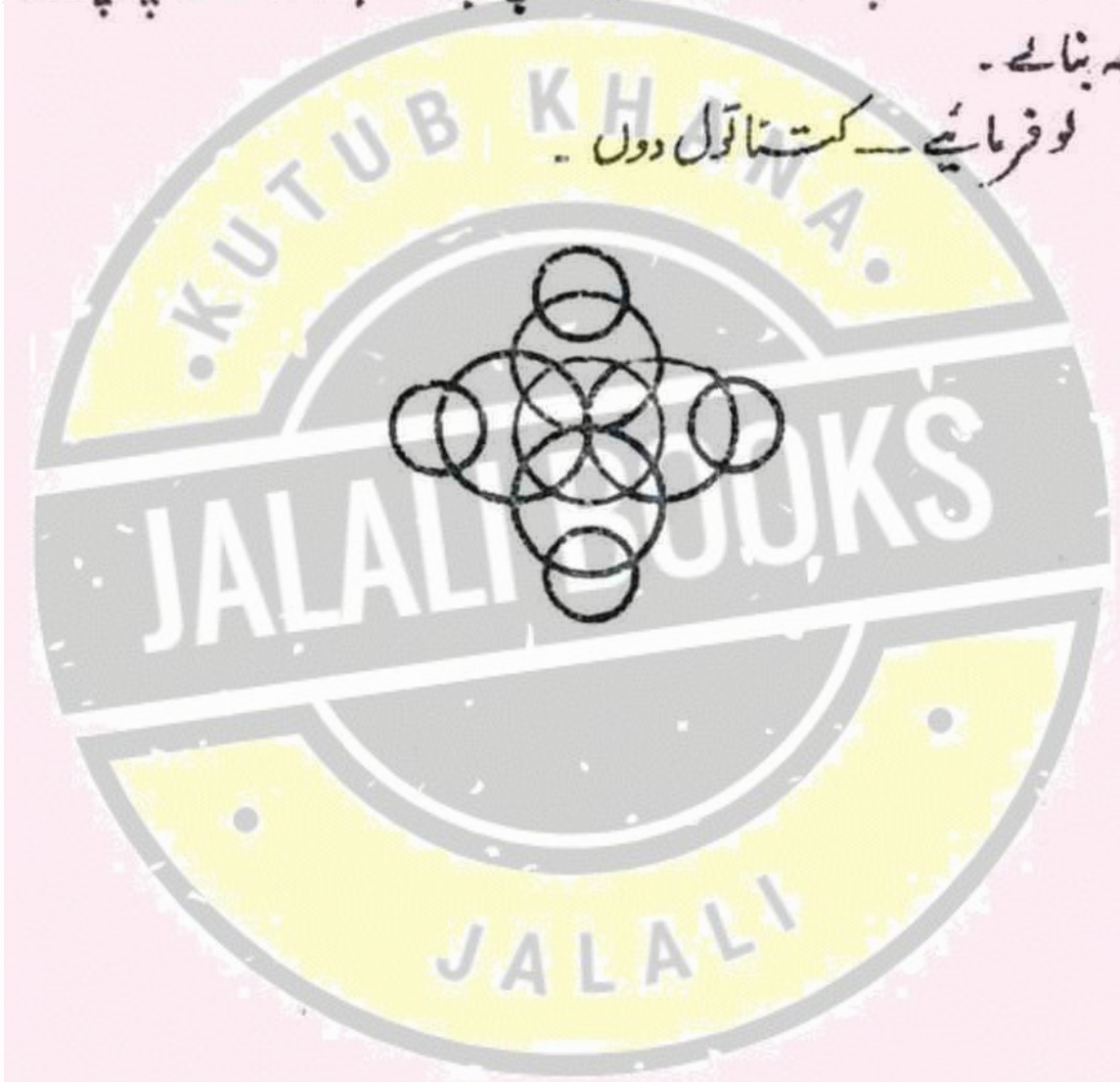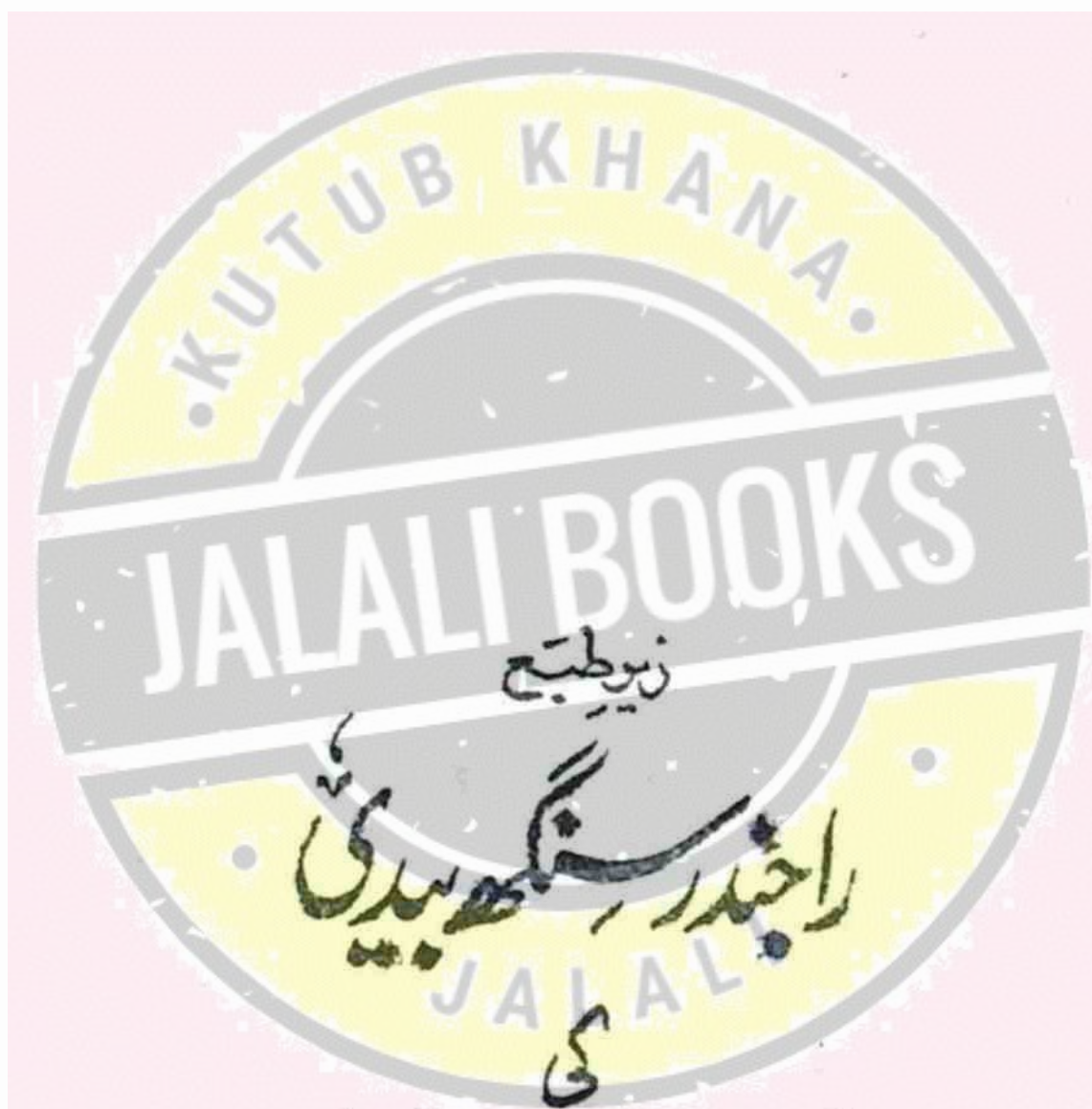
شخصیت اور فن

جسے عاتق شاہ نے لکھا ہے

(ایم۔ اے کا مقالہ)

عاتق شاہ

عاتق شاہ کی پہلی کہانی "گرگٹ" ہے جو حیدرآباد کے اخبار "میزان" میں ۲۱ مئی ۱۹۴۵ء کو شائع ہوئی اور پہلا مجموعہ "فٹ پاتھ کی شہزادی" مئی ۱۹۴۰ء میں منظرِ عام پہ آیا۔ ۱۹۵۳ء میں حکومت حیدرآباد کے منعقدہ اردو مختصر افسانے کے ایک مقابلے میں جسمیں ایک سو تیئیس افسانہ نگاروں نے حصہ لیا تھا، شاہ نے اپنے افسانے "مائی ڈیر شکنتلا" پر پہلا انعام حاصل کیا۔ اب تک ان کے چھ مجموعے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ شاہ لکھتے نہیں بلکہ زمانے اور زندگی کی تلخ حقیقتیں ان سے لکھواتی ہیں اپنے منفرد اسٹائل کی وجہ سے یہ فوراً پہچانے جاتے ہیں۔

7

۷ رنومبر ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ میٹرک [illegible]
کے چکر میں پھنس گئے، آخر دس سال کی جدوجہد کے بعد انہوں نے پھر تعلی[illegible]
چنانچہ مارچ ۱۹۶۳ء میں ایوننگ کالج حیدرآباد سے درجۂ دوم میں بی۔ اے [illegible]
میں عثمانیہ یونیورسٹی سے درجۂ اول میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔
اردو کے لکچرر [illegible]